

فتاویٰ قاضی

فقیر العصر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی



ایفا پبلیکیشنز

فتاویٰ قاضی

فقیہ العصر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی علیہ الرحمہ

(قاضی القضاة و نایب امیر شریعت امارت شرعیہ بہار و اتریسہ
و بانی اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا و صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

ایفا پبلیکیشنز

۱۶۱- ایف جوگابائی، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵

جملہ حقوق محفوظ

کتاب : فتاویٰ قاضی
 افادات : فقیر العصر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی
 ترتیب و تخریج : امتیاز احمد قاسمی
 سن اشاعت : ۱۴۲۵ھ - ۲۰۰۴ء
 صفحات : ۲۲۵
 قیمت : ۱۲۵ روپے
 تعداد : گیارہ سو
 ناشر : ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی
 مطبع : بھارت آفسٹ، دہلی - ۶

ملنے کا بندہ

قاضی پبلیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

بی-۳۵، بسمت، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی - ۱۱۰۰۱۳

فَلَوْلَا
 نَفَرٌ مِنْ
 كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ
 لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ

فہرست مضامین

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۶۰	باب القراءة (قرأت کا بیان)	۱۱	مقدمہ (حضرت مولانا مفتی محمد ظفر الدین مفتاحی)
۶۰	فاتحہ اور سورہ کے درمیان بسم اللہ پڑھنا کیسا ہے؟	۱۷	پیش لفظ (حضرت مولانا بدر الحسن القاضی)
۶۷	جماعت کی نماز ہو جانے کے بعد آنے والا سری قرأت کرے گا یا جہری؟	۲۷	حضرت قاضی صاحب کے فتاویٰ اور ان کی خصوصیات (حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی)
۶۸	باب النوافل (نفل نماز کا بیان)	۳۱	حضرت قاضی صاحب کا فقہی منہج خود آپ کی تحریروں کی روشنی میں (حضرت مولانا شعیب احمد بستوی)
۶۸	تہجد کی نماز باجماعت پڑھنے کا حکم	۵۳	عرض مرتب (امتیاز احمد قاضی)
۷۱	باب صلاة المسافر (مسافر کی نماز سے متعلق احکام)	۵۷	کتاب الطہارۃ (پاکسی حاصل کرنے کے احکام)
۷۱	کیا وطن اصلی متعدد ہو سکتا ہے	۵۷	بغیر عذر شرعی تیمم کرنے کا حکم
۷۷	باب الجمعة (نماز جمعہ کے مسائل)	۵۸	کتاب الصلاة (نماز کے احکام)
۷۷	خطبہ کے دوران اردو میں تقریر	۵۸	باب صلاة العیدین (نماز عیدین کے مسائل)
۷۷	خطبہ کی اذان کے بعد دعا		
۷۷	نماز جمعہ فوت ہو جائے تو ظہر کی نماز پڑھے گا		
۷۹	باب الامامة (امامت سے متعلق مسائل)		
۷۹	کنوارے شخص کی امامت کا حکم	۵۸	کیا تکبیر تشریق کے الفاظ حدیث سے ثابت ہیں؟

”اللہ تعالیٰ نے جن کو تفقہ عطا کیا انہوں نے ہر عہد میں امت کی رہنمائی کی اور بدلتے ہوئے حالات میں انفرادی اور اجتماعی امور میں واضح ہدایات پیش کیں۔ پندرہ سو سال کی اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ فقہاء نے ہر دور میں اپنا خون جگر جلا کر اور قرآن و سنت کے بحر معانی میں ڈوب کر مسائل کا حل پیش کیا اور اصول و قواعد فقہیہ مرتب کیے، نیز احکام کے استنباط میں پوری زندگی قربان کر دی، اللہ کے ان بندوں کا پیش کردہ عظیم فقہی و علمی سرمایہ امت کا بہت بیش قیمت اور قابل فخر سرمایہ ہے۔“

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۷۹	تابع حافظ کی امامت کا حکم	۹۶	باب العشر
۸۰	اجرت پر امامت کرنے کا حکم		(عشر کے احکام)
۸۱	باب تسویۃ الصفوف	۹۶	کیا ہندوستان کی موجودہ اراضی پر عشر واجب ہے؟
	(صفوں کی درستگی کا بیان)	۹۶	عشر و زکوٰۃ کی ادائیگی اجتماعی ہو یا انفرادی؟
۸۱	درمیان نماز میں شامل ہونے والا کس طرف کھڑا ہو؟	۹۸	کتاب الحج
۸۱	درمیان نماز میں آنے والا جس حال میں امام کو پائے شریک ہو جائے		(حج کے احکام)
۸۲	باب الجنائز	۹۸	حج کی ذیوی پر بھیجے جانے والے کا حج
	(جنائز کا بیان)	۹۸	جس نے اپنا حج فرض نہ کیا ہو کیا وہ حج بدل کر سکتا ہے؟
۸۲	پیٹ میں مرے ہوئے بچے کا جنازہ اور تدفین	۱۰۰	کتاب البیوع
۸۳	کتاب الزکاة		(خرید و فروخت کے احکام)
	(زکاة سے متعلق احکام)	۱۰۰	دو ملکوں کی کرنسیوں کی خرید و فروخت
۸۳	پراویڈنٹ فنڈ میں جمع شدہ رقم کی زکاة	۱۰۱	جانور کی وزن سے خرید و فروخت
۸۳	قرض میں لگی ہوئی رقم کی زکاة	۱۰۳	باب المضاربت
۸۵	گجڑی اور چٹکی کے طور پر دی ہوئی رقم کی زکاة		(مضاربت کے مسائل)
۸۸	باب المصارف	۱۰۳	مضاربت کے ذریعہ کاروبار
	(زکاة و صدقات کے مصرف کا بیان)	۱۰۷	باب القضا یا المعاصرة
۸۸	کیا فی زمانہ سادات کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟		(مروجہ معاملات کے احکام)
۹۱	فدیہ نماز اور اس کا مصرف	۱۰۷	قرض پر کرنسی کی قیمت گرنے کا اثر
۹۳	اسکول و کالج کے طلبہ کو زکوٰۃ کی رقم دینا	۱۰۸	دلال کی اجرت
۹۳	ریلیف کی بجی ہوئی رقم کا مصرف		

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۱۲۵	باب النسب	۱۰۹	کیا یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا میں سرمایہ لگانا جائز ہے، نیز غریبوں اور محتاجوں کی امداد کے لئے سود پر رقم لگانا کیسا ہے؟
۱۲۵	(نسب سے متعلق احکام)	۱۱۰	حرام مال اور اس سے کمایا ہوا نفع
۱۲۶	باب الولایۃ	۱۱۶	کتاب الزکاح
	(ولایت سے متعلق احکام)		(شادی بیاہ کے احکام)
۱۲۶	ماں بچوں کی ولی ہو سکتی ہے؟	۱۱۶	بیوی کی موجودگی میں اس کی بہن سے نکاح حرام ہے
۱۲۷	کتاب الطلاق	۱۱۷	رضاعی بھائی بہن کا آپس میں نکاح حرام ہے
	(طلاق سے متعلق مسائل)	۱۱۹	حالت حمل میں نکاح کرنے کا حکم
۱۲۷	طلاق دینے کا شرعی طریقہ	۱۱۹	تنبہائی میں نکاح نامہ پر دستخط کرانے سے نکاح ہو جائے گا
۱۲۸	طلاق کے لئے کنائی الفاظ کے استعمال میں نیت کا اعتبار	۱۲۰	مطلقہ ہائے عدت گزرنے کے بعد نکاح کرے گی یا عدت کے اندر؟
۱۲۹	کیا بحالت غضب "جواب دیا" سے طلاق واقع ہو جائے گی؟	۱۲۱	سو تیلے ماموں سے نکاح جائز ہے
۱۳۱	"البائن لا ملحق البائن" سے مراد	۱۲۲	مطلقہ عورت سے نکاح
۱۳۱	طلاق کی قسم کا کیا حکم ہے؟	۱۲۳	باب المہر
۱۳۳	طلاق کا حکم		(مہر سے متعلق احکام)
۱۳۳	عدو ذکر کئے بغیر دی ہوئی طلاق کا حکم	۱۲۳	مہر روپے کی شکل میں رکھنا بہتر ہے یا سونے
۱۳۵	حالت حمل میں دی ہوئی طلاق کا حکم		چاندی کی شکل میں؟
۱۳۶	حالت نشہ میں تحریری طلاق کا حکم	۱۲۳	مہر کی ادائیگی کا وقت
۱۳۷	کیا طلاق سکران کا وقوع اجتماعی ہے؟	۱۲۳	بیوی کو دیا ہوا مال اس کی ملکیت ہے
۱۳۰	سکرہ کی دی ہوئی طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے		
۱۳۱	طلاق علی مال طلاق بائن ہوتی ہے		

صفحہ	عنوانات	صفحہ
۱۶۷	باب المقابر	۱۳۲
	(قبرستان کے احکام)	۱۳۳
۱۶۷	قبرستان کی آمدنی کا مصرف	۱۳۵
۱۶۸	ویران مقابر اور اوقاف کے احکام۔ بدلتے ہوئے حالات میں	۱۳۶
۱۶۹	پرانی قبروں میں دوسری میت کی تدفین	۱۳۹
۱۷۱	قبرستان سے دوسرا مصرف لیا جانا	(فتوح فسخ کرنے سے متعلق مسائل)
۱۷۷	باب المساجد	۱۳۹
	(مساجد سے متعلق مسائل)	۱۵۰
۱۷۷	مسجد کی زمین میں تدفین	رجوع کرنا
۱۷۷	مکانوں کے اوپر مسجد کی تعمیر	
۱۷۹	کتاب الہبہ والوصیہ	۱۵۲
	(ہبہ اور وصیت کا بیان)	
۱۷۹	عقد ہبہ کے لئے قبولیت ضروری ہے	۱۵۲
۱۷۹	ہبہ اور وصیت کا مسئلہ	۱۵۳
۱۸۳	جنوبی افریقہ میں بیوہ عورتوں کی رہائش کا مسئلہ	۱۵۳
۲۰۴	کتاب الأضحیہ	۱۵۵
	(قربانی کے احکام)	
۲۰۴	ذم کئی ہوئی بھیڑ کی قربانی ہو سکتی ہے	
۲۰۵	نماز عید سے قبل دی ہوئی قربانی کا حکم	۱۶۰
		وقف سے متعلق مسائل)
		۱۶۰
		باب الوقف علی الاولاد
		(اولاد پر وقف کرنے کا بیان)
		وقف علی الاولاد کا حکم

صفحہ	عنوانات	صفحہ
۲۲۷	بنک سے سود لینا کیسا ہے	۲۰۶
۲۲۸	مال حرام کو صدقہ کرنا کیسا ہے	کتاب الأ طعمہ
۲۲۸	بازار سے خون خریدنا	(کھانے والی چیزوں کا بیان)
۲۲۹	رقم مادر میں دوسرے کے مادہ تولید داخل کرانا	خرگوش کی حلت
۲۲۹	بنک کے قرض سے بنے ہوئے مکان کا حکم	۲۰۶
۲۳۱	کاروبار کے لئے بینک سے قرض لینا	کتاب الحظر والاباحہ
۲۳۱	غیر مسلموں کے نیک اعمال کا بدلہ	(ممنوع و مباح اشیاء کے احکام)
۲۳۳	کتاب المیراث	بوقت ضرورت نانی لگانے کی گنجائش ہے
	(ترکہ و وراثت کے احکام)	۲۱۰
۲۳۳	تقسیم میراث کا مسئلہ	کیا دوسروں کو خون دینا اور بلڈ بینک قائم کرنا جائز ہے؟
۲۳۳	ترکہ سے دین مہر ادا کیا جائے گا	۲۱۰
۲۳۵	کیا بیٹیوں کا نکاح ہوا مال موروثی ہوگا؟	کیا غیر مسلموں کی رقم مسجد کی تعمیر اور روزہ
۲۳۶	بیوہ کو کتنا حصہ ملے گا جبکہ اس کی کوئی اولاد نہ ہو؟	۲۱۱
۲۳۷	بیوی، چار لڑکے اور ایک لڑکی کے درمیان	داروں کے افطار میں خرچ کرنا جائز ہے؟
	وراثت کی تقسیم	تبلیغ دین کے لئے ریڈیو اسٹیشن قائم کرنا
۲۳۹	لڑکیوں کے ساتھ بھتیجہ کا حصہ	۲۱۲
۲۳۹	بیوی، تین لڑکے اور چار لڑکیوں کے درمیان	کسی خاتون کے رقم میں شوہر کے علاوہ کسی اور
	ترکہ کی تقسیم	۲۱۸
۲۴۰	تقسیم ترکہ کا اہم مسئلہ	مرکب مادہ منویہ ڈالنا تاکہ وہ حاملہ ہو
۲۴۱	کتابیات	ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعہ بچے کی پیدائش کا مسئلہ
		۲۱۹
		استحاطہ حمل کا حکم
		۲۲۰
		ٹیلی فون بل کی چوری کا مسئلہ
		۲۲۲
		ڈاکٹری کے پیشہ میں کمیشن کا مسئلہ
		۲۲۳
		پرائیویٹ فنڈ کا حکم اور اس میں جمع شدہ رقم کی زکوٰۃ
		۲۲۴
		سود کی رقم انکم ٹیکس میں دینا
		۲۲۶
		سود کا لینا اور دینا حرام ہے
		۲۲۶

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مقدمہ

(حضرت مولانا مفتی محمد ظفر الدین مفتاحی)

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى

اسلام رب العالمین کا بھیجا دین ہے جو اپنی مکمل صورت میں سید الکونین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس روئے زمین پر انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے آیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جو تاریکی دنیا میں پھیل گئی تھی، اسلام کے آفتاب نے اس کو دور کیا اور اپنی نورانی کرنوں سے پورے عالم کو منور کیا، اس نے بھولے بھٹکے انسانوں کو راہ راست دکھائی اور اس رشتہ کو یاد دلایا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان ہونا چاہئے۔

یہ ظاہر ہے کہ آپ خاتم النبیین تھے، آپ پر نبوت کا دروازہ بند ہو چکا اور اعلان کر دیا گیا کہ آپ کے بعد کوئی رسول اور نبی نہیں آ سکتا، لہذا انبیاء پر اللہ کی طرف سے جو ذمہ داری ہوتی ہے وہ قدرتی طور پر آنحضرت ﷺ کی امت پر آ پڑی، اسی کی تعبیر امام احمد بن حنبلؒ نے فرمائی ہے: "قام أبو بكر يوم الردة مقام الأنبياء" (حضرت ابو بکر فتنہ ارتداد کے وقت انبیاء کی جانشینی فرما رہے تھے)۔

چنانچہ امت محمدیہ اور اس کے اکابر نے اس فرض کو محسوس کیا، اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی اور ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے غفلت نہیں برتی اور انشاء اللہ قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد علماء امت سے جو فریضہ متعلق ہوا ان میں ایک احکام شرعیہ کی رہنمائی بھی ہے، جس کو اصطلاح میں "فتویٰ" سے تعبیر کیا جاتا ہے، فقہ و فتاویٰ کی ضرورت و اہمیت کسی صاحب نظر سے مخفی نہیں، اس فریضہ کو سب سے پہلے خود رسول اللہ ﷺ نے انجام دیا، خود قرآن مجید میں آپ کے اس منصب کی طرف اشارہ موجود ہے، آپ کے بعد صحابہ کرامؓ اور صحابہ کے بعد فقہاء تابعین نے اس بار امانت کو سنبھالا، لیکن اس فن کی باضابطہ تدوین و ترتیب کے لئے اللہ رب العزت نے اپنے جس بندہ کا انتخاب فرمایا وہ امام ابو حنیفہ ہیں، جو تابعی تھے، آپ کی ولادت سن ۸۰ ہجری میں ہوئی اور وفات ۱۵۰ ہجری میں، اس طرح پہلی صدی ہجری میں اس اہم فن کی باضابطہ اور فنی تدوین کا کام شروع ہو گیا۔

پھر امام ابو حنیفہ کی خدا ترسی اور احتیاط یہ ہے کہ آپ اپنے علم و فضل کے اعتبار سے اس خدمت کو تنہا بھی انجام دے سکتے تھے، لیکن آپ نے تنہا کام کرنے کے بجائے اپنے دور کے مختلف فنون کے ماہرین کو ساتھ لیا، اور ان کے تعاون سے یہ خدمت انجام دی، تاکہ غلطی کا امکان کم سے کم ہو، پھر کام کا سچ بھی خود متعین فرمادیا کہ احکام شرعیہ کا اولین ماخذ قرآن مجید ہوگا، جو احکام قرآن مجید میں نہیں ہیں، تو سنت رسول سے رجوع کیا جائے گا، اگر حدیث میں بھی موجود نہ ہو تو اقوال صحابہ سے روشنی حاصل کی جائے گی۔

چنانچہ ملا علی قاری (متوفی ۱۰۱۳ھ) نے امام ابو حنیفہ کی نسبت سے لکھا ہے:

"الحاصل أن التابعين أفضل الأمة بعد الصحابة فنعتقد أن الإمام الأعظم والهمام الأقدم أبو حنيفة أفضل الأئمة المجتهدين وأكمل الفقهاء في علوم الدين" (شرح فقہ اکبر ص ۱۳۶) (حاصل یہ ہے کہ صحابہ کے بعد امت میں سب سے افضل گروہ تابعین کا ہے، پس ہمارا عقیدہ ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ ائمہ مجتہدین میں سب سے افضل اور فقہاء علوم دین میں سب سے کامل امام ہیں)۔

علماء رافضیوں نے صراحت کی ہے کہ امام ابو حنیفہ لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار،

پرہیزگار، کریم النفس اور دین کے باب میں محتاط تھے، احتیاط کا حال یہ تھا کہ ذاتی رائے کے اظہار سے اجتناب برتنے کی کوشش کرتے، کسی بھی علمی مسئلہ میں عام طور پر اس وقت تک جواب نہیں دیتے جب تک اہل علم کو جمع کر کے کھلے طور پر بحث نہیں کر لیتے، اور ان کی تائید حاصل نہیں ہو جاتی (دیکھئے: رد المختار ۱/۲۲)۔

اسی تقاضہ احتیاط کے تحت آپ نے فرمایا کہ جو صحیح حدیث سے ثابت ہو، وہی میرا مذہب ہے: "إذا صح الحديث فهو مذهبي" (مختود رسم مفتی)۔

نیز آپ کے بارے میں منقول ہے: "سئل أبو حنيفة إذا قلت قولاً وكتاب الله يخالفه قال أتركوا قولی بكتاب الله فقل إذا كان خبر الرسول ﷺ يخالفه قال أتركوا قولی بخبر رسول الله ﷺ فقل إذا كان قول الصحابة يخالفه قال أتركوا قولی بقول الصحابة" (عقد الجید للشاہ ولی اللہ دہلوی ۵۳) (امام ابو حنیفہ سے دریافت کیا گیا کہ جب آپ کا قول کتاب اللہ کے خلاف ہو تو کیا کیا جائے؟ امام صاحب نے فرمایا: کتاب اللہ کو لو، میرے قول کو چھوڑ دو، دریافت کیا گیا جب حدیث آپ کی رائے کے خلاف ہو، آپ نے فرمایا: میرے قول کو چھوڑ دو، حدیث کو لو، پوچھا گیا کہ جب صحابہ کی رائے اس کے خلاف ہو، آپ نے فرمایا: میرے بجائے صحابی کا قول لو)۔

امام عبد الوہاب شمرانی نے کتاب المیزان میں نقل کیا ہے: "فقد روى الشيخ محيى الدين فى الفتوحات المكية بسنده إلى الإمام أبي حنيفة أنه يقول إياكم والقول فى دين الله تعالى بالراي وعليكم باتباع السنة فمن خرج عنها ضل" (كتاب الميزان للشمرانى ۵۱) (شیخ محی الدین ابن العربی نے فتوحات مکیہ میں اپنی سند کے ساتھ امام ابو حنیفہ سے نقل کیا ہے کہ امام صاحب فرمایا کرتے تھے: تم لوگ اللہ کے دین میں اپنی

رائے سے کوئی بات کہنے سے بچو، تمہارے لئے سنت کی اتباع ضروری ہے، جو شخص سنت کے دائرہ سے باہر نکلے گا، گمراہ ہوگا۔

غرض کہ فتاویٰ کی جو سنت محمد رسول اللہ ﷺ سے شروع ہوئی، وہ امین ہاتھوں کے ذریعہ امت تک پہنچی، چنانچہ فقہ کے مدون اول امام ابو حنیفہ کی احتیاط اور ورع و تقویٰ کی کیفیت کو آپ نے ملاحظہ کر لیا، اسی طرح بے آمیز طریقہ پر ایک نسل سے دوسری نسل تک فقہ و فتاویٰ کی امانت منتقل ہوتی رہی، جن میں امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، ان کے رفقاء و تلامذہ اور بعد کو چل کر فقہ کی خدمت کرنے اور اسے فروغ دینے والے اہل علم کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔

برصغیر میں بھی شروع ہی سے یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے، یہاں ہر دور میں بڑے علماء، اصحاب بصیرت و فقہاء اور زمانہ کے نبض شناس مفتیان کرام پیدا ہوتے رہے ہیں اور انہوں نے بہت ہی بلند پایہ علمی خدمت سرانجام دی ہے۔ فتاویٰ عالمگیری اور فتاویٰ تاتارخانیہ جیسی کتابیں اس کی روشن مثال ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پورے عالم میں عموماً اور برصغیر میں خصوصاً فقہ اسلامی کی خدمت میں احناف کا حصہ زیادہ رہا ہے اور آج نئے مسائل اور واقعات کے حل میں تمام ہی مکاتب فکر فقہاء حنفیہ کی تالیفات سے استفادہ کرنے پر مجبور ہیں، بلکہ بعض لوگ جو ان سے عناد رکھتے ہیں اور ائمہ مجتہدین کے بارے میں بدگمان ہیں، وہ بھی ان کی کتابوں سے استفادہ کرنے پر مجبور ہیں۔

ہندوستان میں گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے فقہ و فتاویٰ کی خدمت کے لئے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر علماء دیوبند کو جن لیا ہے، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی، حضرت مولانا سہول احمد صاحب، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، حضرت مولانا ابوالحسن محمد سجاد صاحب، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور دوسرے اکابر نے اس میدان میں جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے، اس سے کوئی صاحب انصاف انکار نہیں کر سکتا۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی (قاضی القضاۃ و نائب امیر شریعت امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھاڑکھنڈ، بانی اسلامک فقہ اکیڈمی و سابق صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) بھی ہیں۔ برصغیر ہندو پاک، بنگلہ دیش کے موقر و محبوب علماء میں ان کا شمار تھا

اور ملک و بیرون ملک ان کی علمی بصیرت اور وقت نظر کا اعتراف کیا جاتا تھا، انہیں اپنے اساتذہ کے علاوہ امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی کی صحبت میں رہے اور ان کی فکر کو جذب کرنے کا موقع ملا، امیر شریعت میں جمود نہیں تھا، وہ حالات و زمانہ پر گہری نظر رکھتے تھے، وسیع انظری کے ساتھ مسائل کو سوچتے تھے، وہ کہتے تھے کہ احکام شرعیہ میں جمود کا مزاج نہیں ہونا چاہیے اور مثال دیتے تھے کہ خود امام ابو حنیفہ کے تلامذہ نے ان سے بہت سے مسائل میں اختلاف کیا ہے، حالانکہ انہیں اپنے استاذ سے کچی عقیدت اور والہانہ محبت تھی اور وہ اصول میں اپنے استاذ کی پیروی کرتے تھے۔

قاضی صاحب کے مطالعہ میں جہاں وسعت تھی، کتابوں سے اشتغال تھا، وہیں وہ حضرت امیر شریعت کے بانیض صحبت سے بھی فیضیاب تھے، ان دونوں باتوں نے انہیں وقت نظر اور وسعت فکر سے آراستہ کر دیا تھا، اور وہ پیش آنے والے مسائل و واقعات میں اس مزاج سے فائدہ اٹھاتے تھے، اسی لئے ان کے یہاں وسعت نظر ملتی ہے، وہ زمانہ کے حالات پر نگاہ رکھتے تھے اور شریعت کے اصول و مقاصد (جو فقہاء نے مقرر کیے ہیں) کو سامنے رکھ کر رائے قائم کرتے تھے، اس لئے بعض مسائل اور فتاویٰ میں ان سے اختلاف رائے ممکن ہے، لیکن ان کی آراء کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کے لئے دلائل بھی پیش کرتے ہیں اور سلف صالحین کی آراء کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی رائے پیش کرتے ہیں، رہ گئی قاضی صاحب کے فتاویٰ کی خصوصیات تو عزیز گرامی مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (ناظم المعهد العالی الاسلامی حیدرآباد و جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا) نے اس سلسلہ میں بہت تفصیل اور وضاحت سے اپنی اس تحریر میں روشنی ڈالی ہے، جو فتاویٰ کے اس مجموعہ کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے۔

قاضی صاحب کا ایک بہت بڑا کام "اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا" کا قیام اور اس کے زیر اہتمام فقہی سمیناروں کے انعقاد کا سلسلہ ہے، اس نے ہندوستان کے علماء اور نو جوان فضلاء میں علم و تحقیق کی ایک نئی تحریک پیدا کی ہے، نئے مسائل کی طرف ارباب افتاء کی توجہ دلائی ہے اور اجتماعی غور و فکر کا ماحول بنایا ہے، مجھے یاد ہے کہ پہلے فقہی سمینار میں خود حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

نے خطبہ صدارت پیش کیا تھا، امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی نے افتتاحی خطبہ دیا تھا اور ان حضرات نے اور دوسرے بزرگ شرکاء نے اس عمل کی تحسین فرمائی تھی، قاضی صاحب کی یہ خدمت تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھی جائے گی اور کوئی صاحب انصاف اس کے دور رس اثرات اور مفید نتائج سے انکار نہیں کر سکے گا، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان سمیناروں کے انعقاد میں ابتدائی مرحلہ میں محترم ڈاکٹر منظور عالم صاحب کا نمایاں حصہ رہا ہے، فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کی وفات کے بعد اکیڈمی کی ذمہ داری ہم لوگوں کے کمزور کاندھوں پر آپڑی ہے، اس امانت کا حق اسی وقت ادا ہو سکے گا جب امت کے مختلف حلقوں کے لوگ اپنی صلاحیت اور حیثیت کے مطابق اس اہم کام کا تعاون کریں، حضرت قاضی صاحب کی وفات کے بعد منعقد ہونے والے اس پہلے فقہی سمینار کے موقع سے ان کے فتاویٰ کا مجموعہ پیش کرتے ہوئے مجھے بے حد مسرت ہو رہی ہے، انشاء اللہ ان کی دوسری غیر مطبوعہ تحریریں بھی بتدریج منظر عام پر آئیں گی اور لوگ اس سے نفع اٹھائیں گے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبول عام و تمام عطا فرمائے، اس کو مؤلف کے لئے ذخیرہ آخرت بنائے، اور ان کی کروٹ کروٹ مغفرت فرمائے، ربنا اغفر لنا ولناخوانا الذین سبقونا بالايمان۔

محمد ظفر الدین مفتاحی

(مفتی دارالعلوم دیوبند، صدر اسلامک فکڈ اکیڈمی انڈیا)

۱۲ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ، ۱ جون ۲۰۱۴ء

پیش لفظ

(حضرت مولانا بدر الحسن القاسمی، کویت)

”مفتی“ کا مقام بڑا بلند اور ”فتویٰ نویسی“ کا کام بڑی ذمہ داری کا کام ہے، رب کا کتاب نے قرآن کریم میں ”افتاء“ کی نسبت خود اپنی ذات کی طرف کی ہے، چنانچہ ایک موقع پر فرمایا گیا ہے: ”يَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ“ (النساء: ۱۲) (وہ آپ سے عورتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ اللہ تم کو ان کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے)۔ دوسرے موقع پر کہا گیا ہے: ”وَيَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ“ (النساء: ۱۷۶) (وہ آپ سے سوال کر رہے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ کلالہ کے بارے میں اللہ تم کو یہ حکم دیتا ہے)۔

امام ابن القیم کے بقول مفتی درحقیقت احکام الہی کے بیان میں رب کائنات کا ترجمان اور اس کی نیابت میں دستخط کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے اور جب دنیا کے بادشاہوں کی طرف سے دستخط کرنے والا بلند رتبہ تصور کیا جاتا ہے تو رب کا کتاب اور خالق ارض و سماوات کی نیابت میں دستخط کرنے والا کتنے بلند مقام کا حامل ہوگا، اس کا اندازہ مشکل نہیں ہے، اسے علم و فضل میں کمال کے ساتھ تقویٰ و طہارت کی دولت سے بہرور اور علمی امانت و احتیاط کے وصف سے بھی سرفراز ہونا چاہیے۔

علامہ ابن القیم کے الفاظ میں: ”فكيف بمنصب التوقيع عن رب الارض

والسماوات، فحقیق بمن أقيم في هذا المنصب أن يعد له عدته ويتأهب له أهبة وأن يعلم قدر المقام الذي أقيم فيه“ (اعلام الموقعين ۹/۱) (جب بادشاہوں کی نیابت کرنے والوں کا یہ مقام ہے تو پھر زمین و آسمان کے رب کی نیابت کرنے والے کا مقام کیا ہوگا، چنانچہ جس شخص کو اس مقام پر فائز کیا جائے اس کو اس کے لئے بھرپور تیاری کرنی چاہیے اور اس کے لئے درکار علم و کمال سے بہرور ہونا چاہیے اور جس مقام پر وہ ہے اس کی اہمیت کا ادراک کر لینا چاہیے۔)

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں: ”وليعلم المفتي عمن ينوب في فتواه وليوقن أنه مسئول غدا وموقوف بين يدي الله“ (اعلام الموقعين ۹/۱) (اور مفتی کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ وہ اپنے فتوے میں کس کی نیابت کر رہا ہے اور یقین کر لینا چاہیے کہ کل اس سے اس کے بارے میں باز پرس ہوگی اور اسے اللہ رب العزت کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔)

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ دین کا گہرا علم رکھنے اور نور نبوت سے براہ راست فیضیاب ہونے کے باوجود فتویٰ دینے کی ذمہ داری سے خود کو عام طور پر سبکدوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ میں نے شرکائے بدر میں تین سو افراد کو دیکھا ہے کہ جب ان سے کوئی دینی سوال کیا جاتا تو ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہ ہوتی کہ اس کے بجائے کوئی دوسرا جواب دے۔

ابن لیلیٰ کہتے ہیں کہ: میں نے انصار میں ایک سو بیس افراد کو دیکھا ہے جن میں سے ہر ایک فتویٰ کی ذمہ داری دوسرے پر ڈالنے کی کوشش کرتا تھا (المجموع شرح المہذب ۶۸/۱)۔

امام مالکؒ کا ارشاد ہے: ”من أجاب في مسألة فينبغي قبل الجواب أن يعرض نفسه على الجنة والنار وكيف خلاصه في الآخرة وثم يجيب“ (المجموع شرح المہذب ۶۹/۱) (جو کوئی کسی شرعی مسئلہ کا جواب دے اسے جواب دینے سے پہلے خود کو جنت اور دوزخ پر پیش کر لینا چاہیے کہ آخرت میں اس کی رستگاری کس طرح ہوگی، پھر وہ جواب دے)۔

بعد کے زمانہ میں فتویٰ کے بارے میں بے احتیاطی کا ذکر کرتے ہوئے ابو جیمین الأسدی

کہتے ہیں: ”إن أحدهم ليفتي في المسألة ولو وردت على عمر بن الخطاب لجمع لها أهل بدر“ (المجموع شرح المہذب ۶۹/۱) (بعض لوگ ایسے مسئلہ کا جواب بے دھڑک دے دیا کرتے ہیں جو اگر حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ جواب دینے کے لئے تمام شرکائے بدر کو اکٹھا کر لیتے)۔

سلف کے یہاں ذمہ داری کے اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ بہت سے علماء ایچ بیج سے جواب دینے کے بجائے بڑی صفائی سے کہہ دیا کرتے تھے کہ ”لا أدري“ مجھے یہ مسئلہ معلوم نہیں ہے۔

مشہور ہے کہ امام مالکؒ سے ۴۸ مسئلے پوچھے گئے جن میں ۳۲ کے بارے میں انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور جب ایک مسئلہ کے بارے میں ان کے لاعلمی ظاہر کرنے پر کسی نے کہا کہ یہ تو بڑا آسان مسئلہ ہے تو سخت ناراض ہو کر فرمانے لگے: ”ليس في العلم خفيف أما سمعت قول الله تعالى: 'إِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا' (الزلزلہ: ۵) 'فالعالم كله ثَقِيلٌ خاصة ما يسئل عنه يوم القيامة'“ (علم میں کوئی چیز ہلکی اور آسان نہیں ہے، کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول نہیں سنا کہ: ہم عنقریب تم پر وزنی کلام اتاریں گے۔ لہذا ہر علم مشکل اور باوزن ہے، خاص طور پر وہ باتیں جن کے بارے میں قیامت میں پرشش ہوگی)۔

اسی طرح امام شعبیؒ سے کسی نے کہا کہ آپ فقیہ عراق سمجھے جاتے ہیں اس کے باوجود آپ کو لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے شرم نہیں آتی تو کہنے لگے: ”لكن الملائكة لم تستح حيث قالت: لا علم لنا إلا ما علمتنا“ (البقرہ: ۳۲) (میں کیوں شرم کرتا جبکہ فرشتے بھی یہ اعلان کرتے ہوئے نہیں شرمائے کہ ہمیں اتنا ہی معلوم ہے جتنا آپ نے سکھل دیا ہے، اس سے زیادہ ہم نہیں جانتے)۔

جہالت کے باوجود فتویٰ دینے میں جرأت تو اس زمانے میں عام ہو گئی ہے، حالانکہ فقہاء نے اسے قابل تعزیر جرم قرار دیا ہے۔

امام ربیعہ کا قول ہے: ”بعض من يفتي أحق بالسجن من السارق“ (المدخل لابن بدران ۱۹۵) (بعض فتویٰ دینے والے، چوروں کے مقابلہ میں زیادہ جیل میں ڈالے جاتے)

کے متعلق ہیں۔

موجودہ زمانہ میں "فتویٰ نویسی" کا کام اور بھی پیچیدہ اور مشکل ہو گیا ہے، کیونکہ ایک طرف جدید بے لگام تمدنی ترقی نے نئے مسائل کا طوفان لا کر کھڑا کر دیا ہے اور بقول خلیفہ راشد عمر بن عبد العزیز: "کلمہ زاد الفجور کثرت المسائل" (جس قدر فسق و فجور میں اضافہ ہوگا مسائل بھی اسی قدر بڑھتے جائیں گے)۔

یوب ٹیسٹ بے بی، انسانی دودھ اور منی کے بینکوں، اعضائے تناسل کی سرجری کے ذریعہ تبدیلی، حیثیت انجینئرنگ سے وابستہ اور کلوننگ کے مسائل اس کی مثالیں ہیں۔

دوسری طرف دنیا کے سیاسی، معاشی اور اجتماعی نظام روزمرہ کی تبدیلیوں اور خاص طور پر بینکنگ اور میڈیکل سائنس کی دنیا میں غیر معمولی انقلاب نے سیکڑوں ایسے مسائل پیدا کر دیے ہیں جن کا اب سے پہلے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس لحاظ سے علمائے دین اور ارباب افتاء کی ذمہ داریاں بھی بیحد بڑھ گئی ہیں، چنانچہ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ فتویٰ دینے والے اداروں میں باہم ربط و ہم آہنگی ہو، تاکہ فتوؤں میں تضاد کو کم کیا جاسکے۔

کسی بھی مسئلہ کا شرعی حکم بیان کرنے سے پہلے اس مسئلہ کو پورے طور پر سمجھنا ضروری ہے، اسی لیے امام ابو یوسفؒ نے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا تھا: "من لا یعرف احوال زمانہ لم یجز لہ الفتی" (جس شخص کو اپنے زمانہ کے احوال کا علم نہ ہو اس کے لئے فتویٰ دینا بھی جائز نہیں ہے)۔

اس لئے بینکنگ اور میڈیکل سائنس کے پیچیدہ مسائل کو صحیح طور پر سمجھنے اور حل کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ علماء کے ساتھ ماہرین اقتصادیات اور ڈاکٹروں کی مشترکہ نشست ہو، تاکہ مسئلہ کا ہر پہلو واضح ہو سکے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ موجودہ زمانہ کے جو پیچیدہ تمدنی مسائل ہیں ان کے لئے انفرادی کوششوں کے بجائے اجتماعی بحث و تحقیق کا نظام زیادہ بہتر اور غلط رائے دہی سے بچاؤ کا ذریعہ ہے

اور اس بات کا احساس عالمی طور پر لوگوں کو ہے، اسی لئے مختلف فقہی اکیڈمیاں وجود میں آئیں جن میں تنظیم اسلامی کانفرنس کے ماتحت کام کرنے والی "اسلامی فقہ اکیڈمی"، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے زیر انتظام قائم "فقہ اکیڈمی" اور خود مولانا مجاہد الاسلام قاسمی مرحوم کی قائم کردہ "اسلامک فقہ اکیڈمی نڈیا" خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

مغربی ممالک میں قائم شدہ "یورپی کونسل برائے افتاء و تحقیق" کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے، گوکہ اس کی عمر ابھی تھوڑی اور اس کے جاری کردہ فتوؤں کی تعداد بھی کم ہے، لیکن بڑی نزاکت لیے ہوئے ہیں اور بعض فتوؤں سے اتفاق کرنا بھی مشکل ہے۔

ان کے علاوہ کویت کی "اسلامی تنظیم برائے طبی علوم" نے بھی گزشتہ چند برسوں میں بعض اہم اور نازک جدید طبی مسائل پر فقہاء اور اطباء کے مشترکہ سمیناروں کے ذریعہ اہم خدمت انجام دی ہے، سوڈان میں بھی فقہ اکیڈمی قائم ہو گئی ہے اور مصر کے اسلامی امور کی سپریم کونسل اور دارالافتاء کی طرف سے بھی مختلف نئے مسائل کے بارے میں نقطہ نظر کا اظہار کیا جاتا ہے۔

ایک بات قابل توجہ یہ بھی ہے کہ برصغیر میں اب تک روایتی فتویٰ نویسی کا نظام قائم ہے جس کی رو سے افتاء کا ایک متعینہ کورس پورا کرنے کے بعد ایک عالم دین کو اس کی اجازت ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے سوالات کے جوابات اور حلال و حرام کے بارے میں فتوے دے۔

اس نظام میں طہارت، نماز، روزے، زکوٰۃ، نکاح و طلاق، وقف اور میراث وغیرہ سے متعلق انفرادی طور پر لوگوں کو پیش آنے والے مسائل کے بارے میں رہنمائی کی جاتی ہے اور فتوؤں کا وزن مفتی کے علم و فضل میں شہرت و عظمت سے جڑا ہوتا ہے اور مفتی کی ذمہ داری پیش آمدہ مسئلہ میں فقہائے متاخرین کی کتابوں خاص طور پر علامہ ابن عابدین کی شامی، فتاویٰ عالمگیری، فتاویٰ قاضی خاں، فتاویٰ تاتارخانیہ اور فتاویٰ بزازیہ وغیرہ سے جزئیہ نقل کر دینے سے پوری ہو جاتی ہے، اس نظام میں مفتی کا کام صرف نقل ہے، نہ فقہاء کے اقوال میں ترجیح اور نہ دلائل کا ذکر اس کی ذمہ داری ہے۔

جبکہ سعودی عرب اور کویت وغیرہ میں "فتویٰ نویسی" کا کام فرد واحد کے بجائے علماء کی

ایک کمیٹی کے سپرد ہوتا ہے اور مسلم کی پابندی کا عام رجحان نہ ہونے کی وجہ سے دلائل کا ذکر اور مختلف اقوال میں ترجیح کا طریقہ بھی بسا اوقات اختیار کیا جاتا ہے یا فتویٰ کو ایک قرارداد کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ان طریقوں میں سے ہر ایک نظر ثانی کا محتاج ہے۔ پہلے طریقہ میں عرف اور حالات سے قطع نظر بعض دفعہ ایسے فتوے سامنے آتے ہیں جو حیرت کا سبب بنتے ہیں اور ایک خاص ماحول میں لکھی ہوئی عبارت نص شارع کا درجہ اختیار کر لیتی ہے، جبکہ دوسرے طریقہ میں کسی متعینہ منہج کی پابندی نہ ہونے کی وجہ سے بعض دفعہ اصول کی خلاف ورزی ہو جایا کرتی ہے اور اجتہاد کے زعم میں بعض ایسے فتوے سامنے آتے ہیں جو ”انضباط“ کے بجائے ”انفلات“ کی طرف لے جانے والے ہوتے ہیں۔

میرے خیال میں موجودہ زمانہ کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اور اس حقیقت کو بھی کہ حضرت مولانا تھانویؒ، مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، مفتی مہدی حسن شاہ جہانپوریؒ جیسی فقہی بصیرت رکھنے والی شخصیات منصب افتاء کی زینت بننے کے لئے اب خال خال ہی پیدا ہوتی ہیں اور وقف اور زکوٰۃ جیسے امور میں بھی اب بعض ایسے پیچیدہ مسائل سامنے آتے ہیں جن کو حل کرنے کے لئے ایک سے زائد علماء کی فقہی بصیرت درکار ہوتی ہے، اس لئے ہر مستند دارالافتاء میں مسائل کی تقسیم کا ایک لائحہ عمل تیار ہونا چاہیے، نماز، روزے اور طلاق وغیرہ سے متعلق روزمرہ کے سوالات کے جوابات تو انفرادی طور پر مفتی صاحبان لکھا کریں، لیکن ایسے مسائل جو نئے اور پیچیدہ ہوں مثال کے طور پر انشورنس، اسٹاک ایکسچینج، اوقاف اور زکوٰۃ کے اموال کی سرمایہ کاری بینکوں میں رائج مختلف قسم کے کریڈٹ اور دیگر اقسام کے کارڈ وغیرہ، قبضہ کی نئی شکلیں، اسی طرح موجودہ زمانہ کی پیچیدہ اور غیر واضح سیاسی صورت حال میں دارالحرب اور دارالاسلام وغیرہ کی تقسیم سے متعلق سوالات کا جواب لکھنے کے لئے علماء کی اور ارباب افتاء کی مجلس تشکیل دی جائے جو مکمل تحقیق کے بعد باہمی صلاح و مشورے سے ان چیزوں کا شرعی حکم بیان کرے۔

برصغیر کے نامور علماء کے فتاوے کے مجموعوں کے علاوہ مصر، سعودی عرب اور کویت وغیرہ

سے شائع شدہ فتووں کے مجموعوں پر نظر رکھنا بھی مفتیان کرام کے لئے ضروری ہے، عرب دنیا کے ارباب افتاء میں سے اگر بعض، تصویر کشی، سینما بینی اور موسیقی وغیرہ کے بارے میں آزادانہ رجحان رکھتے ہیں تو ایسے اہل علم کی بھی کمی نہیں ہے جو ان امور میں نہ صرف محتاط بلکہ ایک حد تک سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔

موجودہ زمانہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ائمہ مذاہب اور دیگر فقہائے امت کے خلاف ایک چھوٹے سے گروہ کی ہرزہ سرائی سے قطع نظر مختلف فقہی مذاہب کے علماء کے درمیان مصنوعی حد بندیاں ختم ہو گئی ہیں اور تمام مذاہب سے استفادہ کا رجحان اہل علم میں بڑھ گیا ہے، چنانچہ خود سعودی عرب کے ”ہیئۃ کبار العلماء“ کا مسائل کے بارے میں انداز تحقیق یہ ہے کہ پہلے ہر مسئلہ کے بارے میں مذاہب اربعہ کی کتابوں سے ہر ایک کا نقطہ نظر دلائل کے ساتھ نقل کیا جائے، پھر ان میں سے کسی ایک رائے کو ترجیح دی جائے۔

”طلاق ثلاثہ“، پوسٹ مارٹم اور اعضاء کی پیوند کاری وغیرہ کے مسائل پر ”ہیئۃ کبار العلماء“ کی غیر جانبدارانہ تحقیق کو دیکھا جاسکتا ہے۔

برصغیر میں سواد اعظم فقہ حنفی کے پیروکار ہے، جبکہ سعودی عرب کی تعلیم گاہوں اور عدالتوں میں فقہ حنبلی کو فوقیت حاصل ہے، شام، عراق اور مصر وغیرہ میں فقہ شافعی، مالکی اور حنفی قدم بہ قدم ہیں۔

جبکہ تیونس، الجزائر، مراکش اور موریتانیہ وغیرہ میں اکثریت فقہ مالکی پر عمل کرنے والوں کی ہے، لیکن ضرورت پڑنے پر ایک مسلک کے ماننے والوں کا دوسرے مسلک کے کسی جزئیہ پر عمل کرنے کی گنجائش اکابر اہل علم نے تسلیم کی ہے اور سب سے اچھی اور زندہ مثال حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ”الحیۃ الناجزۃ للخیلۃ العاجزۃ“ ہے، جس میں آپ نے ضرورت کی بنا پر مسئلہ کی مکمل تحقیق و تنقیح کرنے کے بعد فقہ مالکی پر عمل کو اختیار فرمایا ہے۔

فتویٰ کے بارے میں یہ حقیقت بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ ایک طرف اردن شوری جیسے اسلام اور مسلمانوں سے پر خاش رکھنے والے لوگوں نے ”فتووں کی دنیا“ کو چیلنج کیا

ہے تو دوسری طرف ناپختہ علم رکھنے والے خود و قسم کے مفتیوں نے جان و مال اور عزت و آبرو کی حرمت اور شریعت کے بنیادی مقاصد کا لحاظ کیے بغیر انتہائی نازک مسائل میں فتوؤں کی بھرمار کر دی ہے جن کی وجہ سے مسلمان نوجوانوں کا خون ارزانی کے ساتھ بہہ رہا ہے اور سارا عالم اسلام ہی دشمنوں کے غرغہ میں ہے۔

ایسے ماحول میں با بصیرت علماء کا فریضہ ہو جاتا ہے کہ وہ فتوے کی زمام اپنے ہاتھوں میں لیں اور تمام اہم اور نازک مسائل میں امت کی رہنمائی کریں۔

برصغیر کی تاریخ میں بھی ایک سے بڑھ کر ایک ماہر مفتی پیدا ہوئے ہیں اور قریب کے زمانہ میں جن لوگوں پر فتویٰ کا مدار رہا ہے، ان میں حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا عبدالحی لکھنوی، مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی عزیز الرحمن دیوبندی، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا ابوالحسن محمد سجاد بہاری، مولانا عبدالصمد رحمانی، مولانا انوار اللہ خاں حیدر آبادی، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، مفتی محمود حسن گنگوہی اور مفتی عبدالرحیم لاچپوری امتیازی شان کے حامل رہے ہیں۔ جہاں تک مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کا تعلق ہے تو ان کی شناخت ”قاضی شریعت“ کی حیثیت سے رہی ہے اور قضا کے مسائل پر ان کو بڑا درک حاصل تھا، قدرت نے انہیں فطری ذکاوت و ذہانت اور بے مثال عبقریت کے ساتھ غیر معمولی فقہی بصیرت عطا کی تھی اور قضا کا پیر ہن ہر لحاظ سے ان پر چست تھا، چنانچہ قضاء مقدمات اور فصل خصومات میں ان کی معاملہ فہمی، دقت نظر اور سرعت ذہنی کو دیکھ کر بسا اوقات خیر القرون کے قاضی شریح اور ایاس بن معاویہ وغیرہ کی یاد تازہ ہو جایا کرتی تھی۔

”افتاء“ کا دائرہ ”قضا“ سے الگ اور ”مفتی“ کا منصب ”قاضی“ کے منصب سے جدا گانہ ہے، لیکن دونوں کے لئے جو چیز قدر مشترک کے طور پر درکار ہے وہ ”تفہم فی الدین“ اور شرعی نصوص اور فقہی اصول و کلیات کو روزمرہ کے واقعات و حالات پر منطبق کرنے کی صلاحیت ہے جس میں قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی اپنے بہت سے معاصر علماء پر فوقیت رکھتے تھے۔

امارت شریعہ میں ان کی زندگی یوں تو قضا کے تقاضوں سے ہی جڑی رہی، لیکن ضرورت

پڑنے پر فتویٰ نویسی کی خدمت انجام دینے سے بھی انہوں نے گریز نہیں کیا، ”فتاویٰ امارت شریعہ“ میں شائع شدہ بعض فتوؤں پر ان کے تحقیقی حاشیوں اور ”بحث و نظر“ میں شائع شدہ متفرق فتوؤں سے بھی ان کی فتویٰ نویسی میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے، البتہ زندگی کے آخری سالوں میں فقہ اکیڈمی، ملی کونسل اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی سرگرمیاں ان کی زندگی کا اصل حصہ بن گئیں اور ان کی زندگی کے یہ سال بڑے با فیض اور بار آور گزرے اور متعدد اہم کارنامے اپنی مسلسل علامات کے باوجود اسی زمانے میں انہوں نے انجام دیئے۔ ”صنوان القضا و عنوان الافتاء“ کی تحقیق و تعلیق بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے جسے گویت کی وزارت اوقاف نے بڑے آب و تاب سے شائع کیا ہے، خاص طور پر ”اسلامک فقہ اکیڈمی“ ان کی زندگی کا شاہکار ہے، اس نے ملت میں ایک نئی روح پھونکی، علماء کے سوچنے کا نہج بدلا اور فقہی موضوعات پر بصیرت کے ساتھ کام کرنے والے علماء کی ایک ٹیم تیار کر دی ہے۔

قاضی صاحب مرحوم کی ہمہ جہت دینی، ملی، سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں نے ان کے بہت سے اوصاف کو لوگوں کی نظروں سے اوجھل رکھا، ”فتویٰ نویسی“ بھی اسی ضمن میں آتی ہے۔ خوش قسمت اور لائق مبارکباد ہیں مولانا امتیاز احمد قاسمی جنہوں نے ان کے بظاہر بے نشان فتوؤں کو اکٹھا کر کے ایک مجموعہ تیار کر دیا ہے۔ فقہ اکیڈمی کی طرف سے اس کی اشاعت قاضی صاحب کے ساتھ وفاداری اور اکیڈمی کی زندگی کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ صاحب فتویٰ کو جنت نصیب کرے اور ان کے فتوؤں کا یہ مجموعہ قبول عام حاصل کرے اور عوام و خواص سمجھوں کے لئے نشان راہ ثابت ہو، آمین۔

بدر الحسن القاسمی، مقیم گویت

(نائب صدر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

۲۰۰۳ء

حضرت قاضی صاحب کے فتاویٰ اور ان کی خصوصیات

(حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی)

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کی شخصیت ایک ہمہ جہت اور جامع ترین شخصیت تھی، وہ قلب و دماغ کو فتح کرنے والے خطیب تھے، ان کا اسلوب تحریر ایسا تھا جو دلوں کو چھو لیتا تھا۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے ایسی بصیرت عطا فرمائی تھی کہ ملکی و ملی مسائل میں ان کی رائے حرف آخر سمجھی جاتی تھی، اللہ تعالیٰ نے فہم قرآن کا عجیب ذوق عطا فرمایا تھا اور حدیث سے ان کو خاص شغف تھا۔ تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے اور سیرت نبوی کے واقعات سے استنباح کا ایسا ملکہ تھا کہ کم لوگوں میں اس کی نظیر دیکھنے میں آئی۔ لیکن جو علم ان کی پہچان اور شناخت بن گیا تھا وہ ہے فقہ اسلامی۔ وہ اس فن کے غواص تھے اور ان کے اندر یہ ذوق اس درجہ عالی اور بلند تھا کہ وہ بہت سے مسائل پر کتابوں کی طرف مراجعت کئے بغیر جو رائے دیتے بالآخر وہی درست، کتاب و سنت کے مزاج سے قریب اور سلف صالحین کے اجتہادات سے ہم آہنگ رائے ثابت ہوتی۔

فقہ کے موضوع پر ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، انہوں نے کم و بیش چالیس سال امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ میں قضا کا فریضہ انجام دیا۔ فقہ کے موضوع پر انہیں لکھنے کا موقع کم ملا لیکن جس موضوع پر قلم اٹھایا، کہنا چاہیے کہ اس کا حق ادا کیا۔ اس کی مثال ”اسلامی عدالت“

ہے۔ ان کا سب سے نمایاں کام فقہ و قضا کے میدان میں افراد سازی اور رجال کاری تیار، نیز اسلامک فٹڈ اکیڈمی انڈیا جیسے عظیم الشان ادارہ کی تشکیل بلکہ ایک فقہی و علمی تحریک کی تاسیس تھی۔ عملی طور ان کا سب سے وسیع فقہی سرمایہ وہ فیصلے ہیں جو انہوں نے دارالقضاء امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ سے صادر فرمائے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کو قضا میں جو درک حاصل تھا وہی رنگ و آہنگ افتاء کے باب میں بھی تھا، چونکہ فقہاء کے یہاں اس بارے میں اختلاف ہے کہ قاضی فتویٰ دے سکتا ہے یا نہیں؟ یا عام مسائل میں دے سکتا ہے اور ان مسائل میں نہیں، جن میں فریقین کے دارالقضاء سے رجوع کرنے کا امکان ہو؟ کیونکہ اگر متعلقہ شخص کو کسی مسئلہ کے بارے میں پہلے سے قاضی کی رائے معلوم ہو جائے تو ممکن ہے کہ وہ اسی کے مطابق دعویٰ کرے اور اسی لحاظ سے گواہان تیار کرے، اس لئے ایک گروہ نے قاضی کو مطلقاً اور بعض نے امکانی طور پر اس کی عدالت میں آنے والے مسائل کی بابت قاضی کو فتویٰ دینے سے منع کیا ہے۔

بحیثیت قاضی فتویٰ دینے میں احتیاط

قاضی صاحب امور قضاء میں حد درجہ محتاط تھے اور قریب سے قریب شخص کا کوئی معاملہ ہو، اگر دارالقضاء میں آجاتا تو مجال نہ تھی کہ وہ قبل از وقت اس مقدمہ میں قاضی صاحب کے نقطہ نظر سے آگاہ ہو جائے اور ممکن نہ تھا کہ فیصلہ پر ان تعلقات کا کوئی اثر پڑے، اسی پس منظر میں آپ عام طور پر فتویٰ نہیں دیا کرتے تھے، یا جو فتاویٰ لکھاتے ان پر اپنے دستخط نہیں کرتے تھے، اس لئے دار الافتاء امارت شرعیہ کے ریکارڈ میں آپ کے بہت سے فتاویٰ مختلف مفتیان کرام کے دستخطوں کے ساتھ محفوظ ہیں اور ظاہر ہے کہ اب ان کی شناخت دشوار ہے۔

بعض ایسے مسائل سامنے آتے تھے جن سے دو فریق کا تعلق ہو اور دونوں تیار ہوتے تھے کہ قاضی صاحب کے فتویٰ پر ہم عمل کریں گے، یا ایسے مسائل ہوتے تھے جن کے دارالقضاء تک آنے کی توقع نہیں ہوتی، اسی طرح اخیر کے سالوں میں جب آپ بہت کم محض چند اہم قسم کے مقدمات کے فیصلے لکھاتے تھے تو اس دور میں استفتاء کا جواب بھی دیا کرتے تھے، افسوس کہ ان فتاویٰ کو محفوظ رکھنے کا اہتمام نہیں کیا جاسکا۔

مدارج احکام کی رعایت

قاضی صاحب کے فتاویٰ پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آپ احکام کے مدارج کا بہت لحاظ فرماتے تھے، منصوص و اجماعی مسائل اور اجتہادی و اختلافی مسائل میں فرق کرتے تھے، منصوص و اجماعی مسائل میں آپ نص اور اجماعی رائے سے ذرا بھی تجاوز کو گوارہ نہیں فرماتے تھے، جامعہ اسلامیہ بھٹکل سے ایک استفتاء مصارف زکوٰۃ کے سلسلہ میں آیا، ان حضرات نے پہلے جامعہ ازہر سے فتویٰ منگایا تھا، ازہر کے ارباب افتاء نے زکوٰۃ سے ایسے علاقوں میں مساجد و مدارس کی تعمیر کی اجازت دی تھی جہاں مسلمان غربت کی وجہ سے مسجد تعمیر کرنے پر قادر نہیں ہیں، قاضی صاحب نے واضح طور پر اس جواب سے اختلاف کیا اور اپنے جواب میں تحریر کیا:

باجماع ائمہ اربعہ مساجد و مدارس کی تعمیر، سرک کی مرمت وغیرہ جیسے کاموں میں زکوٰۃ خرچ نہیں کی جاسکتی، امام ابوحنیفہؒ کے یہاں اس کی وجہ تملیک کا فقدان ہے اور دیگر ائمہ کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ ”فی سبیل اللہ“ کی تعریف میں یہ داخل نہیں ہے، جہاں تک مدارس کے طلباء کی کفالت کا تعلق ہے، اگر وہ محتاج ہیں تو ان پر زکوٰۃ خرچ کی جاسکتی ہے، اسی طرح مصیبت زدہ پریشان حال مسلمان اگر محتاج ہیں تو انہیں زکوٰۃ بے تکلف دی جاسکتی ہے۔

اسی طرح ایک خاتون نے جسے نکاح کے آٹھ سال بعد حمل ٹھہرا تھا اور حمل پر پانچ ماہ کی مدت گزر چکی تھی، ڈاکٹروں کے بیان کے مطابق اس بات کا غالب امکان تھا کہ نومولود دماغ و جسمانی مریض ہوگا اور ایک سال کے اندر اس کی موت واقع ہو جائے گی، اس لئے والدین چاہتے تھے کہ حمل ساقط کرادیا جائے، آپ نے اپنے فتویٰ میں اس سے سختی سے منع کیا اور فرمایا کہ یہ ایک زندہ یقینی وجود کو متوقع خطرہ کی وجہ سے موت کے گھاٹ اتار دینا ہے، پھر آپ نے آگے مختلف فقہاء کے حوالہ سے لکھا کہ بچہ میں جان آنے کے بعد اسقاط حمل حرام ہے اور اس پر اجماع ہے۔

احوال زمانہ کا لحاظ

لیکن جو مسائل مجتہد فیہ اور اختلافی ہوتے یا جن میں حالات کے تغیر کی وجہ سے احکام میں تغیر کی ضرورت پیش آتی وہاں اس رعایت کو بھی ملحوظ رکھتے، ایسے کئی فتاویٰ آپ کے موجود ہیں، مثلاً ایک صاحب نے جہیز کے بارے میں سوال کیا اور اس سلسلہ میں حضرت فاطمہؓ کو جو رسول اللہ ﷺ نے چند چیزیں دی تھیں، اس سے استدلال کیا تھا، قاضی صاحب نے اس کے جواب میں رد کیا ہے اور لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے جو کچھ دیا اس کے لئے نہ حضرت علیؓ کا مطالبہ تھا، نہ سماج کا کوئی دباؤ اور وہ بھی اس پس منظر میں تھا کہ حضرت علیؓ آپ ہی کے زیر پرورش تھے، اس لئے اسے سنت قرار دینا درست نہیں، آپ نے فتویٰ کے اخیر میں اس سماجی برائی پر نکیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

سرمایہ اور نمائش کے لئے اپنی بیٹیوں کو بہت کچھ دے کر دوسرے غریب لوگوں کو مصیبت میں ڈالتے ہیں، اسلام نمائش کی بھی اجازت نہیں دیتا، ان حالات میں جو جہیز مسنون ہے اس میں اور جو جہیز مروج ہے اس میں صرف لفظ کا اشتراک ہے، حقیقت دونوں کی بالکل علاحدہ ہے، لہذا مروجہ جہیز کو سنت قرار دینا بالکل صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ قطعی طور پر ناجائز رواج ہے، جس کے مٹانے کی کوشش کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

آج کل اوقاف کی بہت ساری زمینیں ضائع ہو رہی ہیں اور جو ویران اراضی وقف ہیں وہ ناجائز تصرف میں آ جاتی ہیں، اسی پس منظر میں وقف کی بعض اراضی کو مسلمانوں کے مفاد کے لئے کارآمد بنانے کے نقطہ نظر سے بہار اسٹیٹ سنی وقف بورڈ نے ایک استفتاء بھیجا تھا، قاضی صاحب نے اس کے جواب میں جو فتویٰ لکھا، اس میں احتیاط بھی ہے، وقف کے مفادات کا تحفظ بھی اور حالات کی رعایت بھی، چنانچہ رقم طراز ہیں:

قبرستان اگر پرانا ہو چکا ہے اور مدتوں سے اس میں تدفین عمل میں نہیں آرہی ہے اور نہ بظاہر حال مستقبل قریب میں تدفین کے مصرف میں اس کے استعمال کا امکان ہے، تو ایسی صورت میں قبرستان کی زمین کا وہ حصہ جس میں پہلے تدفین عمل میں نہیں آئی ہے اور نہ وہاں قبروں کے آثار ہیں اور اسی طرح وہ حصہ جس

میں بھی تدفین عمل میں تو آتی ہے لیکن قبریں اتنی پرانی ہو چکی ہیں کہ ان میں ہڈیاں بھی مٹی بن گئی ہوں گی، ایسی زمین پر مدرسہ بنانا، مسجد بنانا، یا کسی ایسی عمارت کی تعمیر جو مسلمانوں کے افادہ عام کی ہو، یا جس کی آمدنی مسلمانوں کے زیر انتظام مصارف خیر پر خرچ کی جاسکے جائز ہے، یعنی شرح بخاری میں ہے: "قال ابن القاسم لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبني فيها مسجدا لم أر بذلك بأسا الخ" (۵۹۹/۱) — مندرجہ بالا اصولی حکم کی روشنی میں قبرستان فقیر بارہ وقف نمبر ۶۵ کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

عرف کی رعایت

اسی طرح عرف و حالات کے تغیر کی وجہ سے احکام میں جو فرق واقع ہوتا ہے، قاضی صاحب کے فتاویٰ میں اس کا بھی لحاظ ہوتا تھا، مثلاً بیوی کے علاج کا مسئلہ ہے، قاضی صاحب نے اپنے ایک مقالہ میں بھی اس پر تفصیل سے بحث کی ہے کہ فقہ میں علاج بھی داخل ہے اور اس سلسلہ میں فقہاء کی ان عبارتوں سے استدلال کیا ہے، جو فقہ کی تعریف سے متعلق ہیں، قاضی صاحب نے اپنے ایک فتویٰ میں بھی مختصر الفاظ میں اس پر روشنی ڈالی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

آج کے بدلے ہوئے حالات میں دوا، علاج ضروریات زندگی میں سے ہے اور موجودہ عرف عام میں بھی شوہر کے ذمہ سمجھا جاتا ہے، اس لئے کھانا، کپڑے کے ساتھ ساتھ دوا، علاج کا خرچ بھی شوہر کے ذمہ عائد ہوگا۔

قاضی صاحب کے یہاں فتاویٰ اور مسائل کی تحقیق میں اس بات کا بہت اہتمام تھا کہ سلف کے اقوال کا تتبع کیا جائے، وہ کہتے تھے کہ ہماری کتب فقہ اتنی جامع ہیں اور ہمارے بزرگوں نے ایسی کاوشیں کی ہیں کہ کوئی مسئلہ نہیں جس کا حل ان کتابوں میں موجود نہ ہو، لیکن ضرورت گہرے مطالعہ اور فقہاء کے مقرر کئے ہوئے اصول و قواعد کو سمجھنے کی ہے، اسی پس منظر میں وہ اس بات کو ضروری قرار دیتے تھے کہ اقوال کے مصداق اور افعال کے منشا کو جاننے کے لئے اپنے عہد کے عرف

کی طرف رجوع کیا جائے، اس کے لئے صرف گذشتہ فقہاء کی عبارتوں پر ان کے پس منظر کو جانے بغیر انحصار کر لینا مناسب نہیں۔

اس کی بہت سی مثالیں ان کی آراء میں موجود ہیں، مثلاً اس سوال پر کہ ”باپ اپنی بیٹی کی شادی کے لئے سونا چاندی کے زیورات وغیرہ خرید لے تو اس کی زکوٰۃ باپ پر واجب ہوگی یا بیٹی پر؟“ فرماتے ہیں:

باپ بیٹی کی شادی کی نیت سے زیورات بنوائے یا روپیہ جمع کرے، ایسی چیزیں عام طور پر شادی سے پہلے باپ ہی کی ملکیت تصور کی جاتی ہیں، ہیہہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ بیٹی کو ہوبہوب لے کر ملکیت اور قبضہ میں آجائے اور اس کو تصرف کرنے کا اختیار ہو، اس لئے اس طرح کی جمع رقوم اور زیورات باپ ہی کی ملکیت تصور کئے جائیں گے اور اس کی دیگر املاک کے ساتھ ملا کر زکوٰۃ نکالی جائے گی۔

فتاویٰ میں بھی معاملہ فہمی

جیسے ایک قاضی کسی واقعہ کو بہت ہی وقت نظر کے ساتھ دیکھ کر اور پوری گہرائی سے اور غور کر کے فیصلے کرتا ہے، قاضی صاحب کے یہاں فتاویٰ میں بھی معاملہ فہمی کی یہ کیفیت اور قوت فیصلہ نمایاں نظر آتی ہے، مثلاً ایک افتادہ سرکاری زمین پر عید گاہ تعمیر ہوئی، اب سوال یہ ہوا کہ یہاں مسجد بنائی جاسکتی ہے؟ جبکہ سرکاری طرف سے مسلمانوں کے حق میں کوئی صریح اجازت نامہ نہیں ہے، ایسی صورت میں کیا یہ ارض مقصوبہ پر مسجد کی تعمیر نہیں سمجھی جائے گی؟ قاضی صاحب نے مسلمانوں کے تصرف کے باوجود حکومت کی طرف سے کوئی اعتراض نہ کئے جانے کو دلالت اجازت قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین افتادہ تھی جس میں آج سے ۴۰ سال پہلے عید گاہ تعمیر ہوئی اور آج تک یہ اراضی مسلمانوں کے قبض و دخل میں چلی آرہی ہے، کسی سرکاری محکمہ کی طرف سے اس پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا، زمین گہری

ہوئی چہاردیواری کے اندر ہے، پس قبض و دخل مکمل ہے، کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں، بلکہ زمین حکم اراضی موات کی تھی، ظاہر حال یہ ہے کہ اجازت سے عید گاہ بنائی گئی اور اس طویل قبض و دخل اور بصورت عید گاہ زمین کی ہیئت عام افتادہ اراضی سے بدل چکی ہے، اسی صورت میں اس پر مسجد بنائی جاسکتی ہے، البتہ مناسب ہے کہ آئندہ کے رفع شر کے لئے اس کی بندوبستی کرائی جائے۔

ایک واقعہ میں ایسا ہوا کہ لڑکے کے والدین نے اولاً طلاق سے انکار کیا اور بعد میں دعویٰ کرنے لگے کہ لڑکے نے طلاق دے دی تھی، قاضی صاحب نے اس سلسلہ میں جو فتویٰ دیا ہے وہ کسی مسئلہ پر گہرائی کے ساتھ غور و خوض کی بہترین مثال ہے:

چونکہ لڑکے کے والد اور والدہ نے اولاً طلاق سے انکار کیا، یعنی اگر واقعہ صحیح تھا تو جھوٹ بولا، یا حق کو چھپایا اور بھائی جو مولوی صاحب ہیں، انہوں نے بھی بروقت شہادت نہیں دی اور شہادت میں تاخیر کی اور یہ معاملہ امور حسیہ دینیہ میں سے ہے اور ایسے معاملہ کو چھپانا یا شہادت میں تاخیر کرنا یا جھوٹ اور التابیان دینا، خود شاہدین کے بیان کے مطابق ان کے لئے موجب فسق ہے، لہذا یہ لوگ فاسق قرار پاتے ہیں اور فاسق کی شہادت شرعاً معتبر نہیں، اس لئے ان لوگوں کے بیان سے طلاق ثابت نہیں مانی جائے گی، اب شوہر سے قسم پانچوں کے سامنے لے لی جائے، اگر وہ یحیٰی کے ساتھ طلاق کا انکار کرے تو طلاق واقع نہیں مانی جائے گی، ہاں اگر شوہر اقرار کرے یا قسم کھانے سے انکار کرے تو طلاق ثابت مانی جائے گی۔

ایک شخص نے نفقہ کی ذمہ داری سے بچنے کے لئے دعویٰ کر دیا کہ اس نے دو سال پہلے ہی اپنی بیوی کو طلاق دے دیا تھا، قاضی صاحب نے اس پس منظر میں جواب دیا:

صورت مسئلہ میں شوہر نفقہ کی ذمہ داریوں سے فرار کے لئے دو سال پہلے طلاق دینے کا دعویٰ کرتا ہے، یہ اقرار ہے جس کے ذریعہ دوسروں کے حقوق تلف نہیں کئے

جاسکتے ہیں، اس لئے شوہر کے اس بیان کی وجہ سے عورت کا نفقہ ساقط نہیں ہوگا، اگر شوہر نے طلاق دے کر عورت کو مطلع کر دیا ہوتا تو وہ نکاح ثانی کے لئے آزاد ہوتی، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، اس لئے عورت اپنے کو اس کی بیوی سمجھتے ہوئے پابند رہی اور نفقہ جزاء احتباس ہے، اس لئے عورت اس مدت کا نفقہ پانے کی حق دار ہے، رہا مسئلہ طلاق کا تو دو سال پہلے طلاق دینے کا اگر کوئی شرعی ثبوت موجود نہیں ہے تو طلاق وقت اقرار سے نافذ قرار پائے گی، سابق سے نہیں۔

جائز متبادل کی نشاندہی

بہت سے مواقع پر محض کسی بات کو حرام کہہ دینا کافی نہیں ہوتا، بلکہ یہ بات بھی ضروری ہوتی ہے کہ اس کے جائز متبادل کو پیش کیا جائے، قاضی صاحب اپنے زبانی اظہار رائے میں بھی اس کو ملحوظ رکھتے تھے اور آپ کے بعض فتاویٰ بھی اسی طریقہ فکر کے مظہر ہیں، مثلاً ایک گاؤں میں معلم کو زکوٰۃ دینے سے متعلق سوال کیا گیا، قاضی صاحب نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا ہے:

مدرسین کو درس کی اجرت میں فطرہ یا زکوٰۃ دینا جائز نہیں اور اس طرح یہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، ہاں اگر وہ مولوی صاحب جو مسجد میں درس دیتے ہیں، اگر وہ محتاج ہیں اور مستحق زکوٰۃ ہیں تو انہیں فطرہ یا زکوٰۃ کی رقم مستحق ہونے کی حیثیت سے دی جاسکتی ہے، اگر ایسا ہے تو مولوی صاحب کو چاہیے کہ اللہ کی رضا کے لئے پڑھائے اور اہل بستی زکوٰۃ و فطرہ کی رقم جمع کر کے ان کی مدد کریں، بشرطیکہ وہ محتاج اور مستحق ہوں۔

انجمن پنجابیان رام پور نے اسکول کے سلسلہ میں کچھ مشکلات لکھی تھیں اور فی سبیل اللہ کی مد سے زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنے کی اجازت چاہی تھی، آپ نے جواب میں ناجائز صورت پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ جو گنجائش نکل سکتی ہے، اسے بھی واضح فرمایا، چنانچہ رقم طراز ہیں:

زکوٰۃ کی رقم عمارت کی تعمیر و توسیع میں خرچ نہیں کی جاسکتی ہے، غریب طلباء کی فیس، کتابیں، کپڑے وغیرہ میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے، اساتذہ کا

مشاہرہ اگر بطور فیس طلباء سے وصول کیا جاتا ہے تو غریب طلباء پر یعنی بھی فیس آتی ہو وہ زکوٰۃ کی مد سے دی جاسکتی ہے، وہ بچے جو اغنیاء کی اولاد ہیں یعنی جن کے والدین غنی ہیں ان پر نہ بصورت مشاہرہ اساتذہ اور نہ بصورت کتاب زکوٰۃ کی رقم صرف کی جاسکتی ہے، اگر کسی نے زکوٰۃ کی رقم بعد تعلیم دی ہے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ مستحق بچوں کی تعلیم پر خرچ کیا جائے۔

فتویٰ میں تذکیر و ترہیب

فتوے میں آپ اس بات کی بھی رعایت کرتے تھے کہ کہیں ضرورت پیش آتی تو حکم شرعی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تذکیر و ترہیب جملے بھی لکھ دیتے، تاکہ مستفتی کو عمل کی تحریک پیدا ہو، اسی طرح بعض صورتیں جائز لیکن خلاف احتیاط ہوتیں، تو حکم شرعی بتاتے ہوئے احتیاطی پہلو پر بھی متوجہ فرمادیتے، چنانچہ ایک سوال کے جواب میں رقم طراز ہیں:

صورت مسئلہ میں براہ راست شراب کے کام کے لئے ملازمت نہیں ہے، اس لئے آپ کی ملازمت جائز ہے اور آپ کی تنخواہ حلال ہے، البتہ ایک مسلمان کو ایسے کام سے کراہیت ہونا فطری ہے، اس لئے کوشش کر کے دوسرے کام میں منتقل ہونا چاہیے۔

اسقاط حمل کے جس فتوے کا ذکر اوپر آیا ہے، اس کے آخری فقرے اس طرح ہیں: ان حالات میں ہماری رائے میں اسقاط حمل سے قطعی پرہیز کرنا چاہیے، اور کسی نئی جانچ کی بھی ضرورت نہیں، کہ ہم اس کے مکلف نہیں، اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سارے اندازوں کو غلط کر دیں اور اگر خدا نخواستہ بچہ مریض ہی پیدا ہوتا ہے تو اس کی تیمارداری کا اجر باپ کو ملے گا، اور اگر موت ہوگئی تو یہ بچہ والدین کے لئے اجر، ذخیرہ آخرت اور شفاعت کرنے والا ثابت ہوگا، جو دعا ہم بچہ کے جنازہ پر پڑھتے ہیں، اس کا خلاصہ یہی ہے "اے اللہ اس بچہ کو ہمارے لئے اجر بنا، ذخیرہ بنا، اس کو ہمارے لئے شفاعت کرنے

والا بنا اور اس کی سفارش کو میرے حق میں قبول فرما۔

یاد رکھیں کہ مریض کو تکلیف سے بچانے کے لئے دوا دے کر یا دوا چھوڑ کر موت تک پہنچا دینا، (Active) اسلامی نقطہ نظر سے قطعی جائز نہیں، یہ یورپ کی خود غرضی اور عقیدہ آخرت سے محرومی کا نتیجہ ہے، میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ والدین کو آزمائش میں نہیں ڈالے اور بچہ صحیح سالم پیدا ہو، بڑے اور پھلے پھولے، آمین۔

مستفتی کے مصالح کی رعایت

اسی طرح مستفتی کے شخصی مصالح کو بھی پیش نظر رکھتے اور مزاج شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے اسے ایسی بات کی تلقین کرتے جو اس کے مفاد میں ہو، ایک فتویٰ میں اولاد کے درمیان ہبہ میں کمی بیشی کرنے کی شناعت کو بیان کرتے ہوئے استفتاء کے ایک نکتہ پر اس طرح اظہار خیال فرماتے ہیں:

سوال میں یہ بھی ہے کہ ”زید اپنے لئے کچھ نہیں رکھنا چاہتا ہے، زید کو ایسا کرنا اور اپنے کو بالکل تہی دست بنالینا مناسب نہیں ہے، ورنہ زید پریشانی میں پڑ سکتا ہے ہے، ضروری ہے کہ زید اپنی ضروریات کے لئے کچھ رکھ لے۔“

قول دیانت پر فتویٰ

افتاء کے سلسلہ میں اصل اصول یہ ہے کہ قول دیانت کو اختیار کیا جائے، لیکن بہت سے ارباب افتاء قول قضا پر فتویٰ دیا کرتے ہیں، علامہ انور شاہ کشمیری نے بھی اپنی بعض تحریروں میں اس پر گلہ کیا ہے، قاضی صاحب اپنے فتاویٰ میں اس اصول کو ملحوظ رکھتے تھے، قول دیانت کے مطابق فتوے دیا کرتے تھے، ایک سوال طلاق کے الفاظ کنایہ سے متعلق تھا، قاضی صاحب نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے، فقہاء کی عبارات پیش کی، پھر جواب کا خلاصہ اس طرح درج فرمایا ہے:

پس مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں سوال میں مذکور خط کے جملوں سے طلاق اسی

صورت میں واقع ہوگی، جبکہ کاتب تحریر نے طلاق کی نیت بھی کی ہو، اگر شوہر یہ کہتا ہے کہ اس نے یہ جملے لکھتے وقت طلاق کی نیت بھی نہیں کی تھی تو اس سے حلف لے لیا جائے، اگر وہ حلفاً طلاق کی نیت سے انکار کر دے تو اس کی بات مان لی جائے گی اور اس کی بیوی حسب سابق اس کی بیوی رہے گی، والقول له بيمينه في عدم النية (درمختار ۲/۴۶۵)۔

اسی طرح ایک مسئلہ لفظ طلاق کے تکرار کا آپ کے سامنے آیا، جس میں مستفتی کا کہنا ہے کہ اس کی نیت طلاق رجعی ہی کی تھی، قاضی صاحب نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے:

اگر آپ نے تین بار الفاظ طلاق کے دہرائے لیکن دو یا تین کا عدد نہیں بولے، تو اس صورت میں آپ کی نیت دیکھی جائے گی، اگر آپ کی نیت تین طلاق دینے کی نہیں تھی تو ایسی صورت میں ایک طلاق رجعی واقع ہوگی، عدت کے اندر لوٹا سکتے ہیں واربعد عدت فریقین کی مرضی سے دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔

رفع اختلاف کی کوشش

جن مسائل میں سلف صالحین کے درمیان ایک سے زیادہ آراء رہی ہیں اور ان آراء میں کسی پہلو میں اتباع نفس کا شبہ نہیں تو قاضی صاحب اس میں توسع اور رفع اختلاف کی صورت اختیار کرتے تھے، مثلاً نماز تہجد کی جماعت کے سلسلہ میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

غیر رمضان میں تہجد کے لئے جماعت کا اہتمام چاہے وہ شب برأت ہی کیوں نہ ہو درست نہیں ہے، رمضان المبارک میں تہجد کے لئے جماعت کا اہتمام کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر کچھ لوگ پسند نہیں کریں اور وہ گھر پر یا مسجد میں اپنی نماز تنہا ادا کریں تو انہیں برا کہنا یا ملعون قرار دینا بہت بری بات ہوگی، جس مسجد میں شب برأت میں جماعت سے تہجد ہوتی ہے تو اسے بلاشبہ روک دینا چاہیے، رمضان میں گنجائش ہے، اس لئے اسے روکنا مناسب نہیں، البتہ جو شریک نہیں

ہونا چاہیے اور شریک نہ ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں۔

قاضی صاحب اس بات کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے تھے کہ فتاویٰ امت کے اختلاف کو رفع کرنے اور ان میں اتحاد پیدا کرنے کا سبب بنے اور جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کو افتراق و انتشار سے بچایا جائے، میرے قصبہ جالہ سے قریب گڑھول نامی ایک قدیم آبادی ہے، جو ایک بڑے صاحب نسبت بزرگ حضرت مولانا بشارت کریم کی وجہ سے پورے بہار میں معروف ہے، یہاں پہلے جمعہ نہیں ہوا کرتا تھا، اب آبادی بڑھ گئی ہے، سہولتوں میں اضافہ ہو گیا، اس لئے کچھ لوگ جمعہ قائم کرنا چاہتے تھے اور کچھ اس کے خلاف تھے، قاضی صاحب کے پاس یہ مسئلہ آیا، آپ نے بحیثیت قاضی جمعہ کی اجازت دے دی، کیونکہ امیر و قاضی کی اجازت سے فقہاء احناف کے یہاں نماز جمعہ درست ہو جاتی ہے، اس طرح یہ اختلاف رفع ہو گیا۔

فتویٰ میں بھی اتحاد امت کا لحاظ

ایک جگہ عید گاہ کے سلسلہ میں اختلاف پیدا ہو گیا اور باہمی گروہ بندی کی وجہ سے ایک گروپ نے الگ عید گاہ بنانی چاہی، اس سلسلہ میں استفتاء آپ کے سامنے آیا، آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

آپ لوگ ہرگز دوسری جگہ عید گاہ نہ بنائیں، جہاں پہلے نماز ہو رہی تھی، وہیں نماز ادا کریں، نفسانیت کی بنیاد پر امت میں افتراق پیدا کرنا بڑا گناہ ہے، جیسے پورب محلہ کے امام صاحب نماز پڑھاتے تھے، ویسے ہی پڑھاتے رہیں، آپ سب لوگ مل کر اسلامی اتحاد اور مسلمانوں کی شوکت کا مظاہرہ کریں۔

سوال کا وقت نظر سے مطالعہ

قاضی صاحب کا مزاج یہ تھا کہ وہ سوال کو بھی بہت ہی دقت نظر کے ساتھ غور کرتے تھے، اور سوال پوری طرح سمجھ کر پھر جواب تحریر فرماتے تھے اور بعض اوقات اس کی مزید وضاحت کے لئے جواب میں پہلے خلاصہ سوال کو درج کر دیتے تھے، تاکہ کوئی التباس و اشتباہ باقی نہیں رہے اور

کوئی فریق فتوے کا غلط استعمال نہ کر لے، اس سلسلہ میں آپ سے ڈیٹا میں کمپیوٹر کمپس نامی فرم کے پارٹنر نے جو استفتاء کیا ہے، اس کا جواب پڑھنے کے لائق ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتی کے ذہن میں کتنا چوکس اور اخاذ ہونا چاہیے۔

اسی طرح ایک استفتاء اور اس کے جواب پر محاکمہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

آج استفتاء بحوالہ بالا میری نظر سے گذرا اور اس کا جواب بھی، استفتاء کا جواب دیتے وقت مسئلہ ڈیکلیریشن (زبان انگریزی) کا مفہوم سمجھنے میں تسامح ہوا ہے، ڈیکلیریشن میں مذکور لفظ (Irrecoverable) کا مفہوم لحاظ میں نہیں رکھا گیا ہے، جس کا مفہوم ناقابل استرداد ہوتا ہے، طلاق صریح کے ساتھ ایسے الفاظ کا اضافہ موجب بینونت ہے، لہذا صورت مسئلہ میں ایک طلاق بائن واقع ہو گئی۔

احکام شرعیہ کی حکمت و مصلحت

حکم شرعی کے بجائے بعض لوگ احکام شریعت کی حکمت و مصلحت کے بارے میں سوال کرنے لگتے ہیں، قاضی صاحب ایسے سوالات کے بھی جواب دیتے تھے، لیکن مستفتی کی فکری کوتاہی کی طرف اشارہ بھی فرمادیتے تھے، مدھیہ پردیش کے ایک صاحب نے سوال کیا کہ سائنسی اعتبار سے خرگوش بلی کے قبیل کا جانور ہے، اسے حیض آتا ہے، اسلئے اس کا گوشت حرام ہونا چاہیے، شریعت میں اس کو کیوں حلال قرار دیا گیا؟ قاضی صاحب نے جواب میں پہلے تو اس اصول کو سمجھایا ہے کہ کسی چیز کا حلال و حرام ہونا اصل میں حکم الہی سے متعلق ہے، پھر نصوص نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کے حلال ہونے پر امت کا اجماع ہے، اخیر میں واضح کیا ہے کہ خرگوش ہرن کی طرح ہے نہ کہ بلی کی طرح، بلی درندہ ہے، خرگوش درندہ نہیں، بلی حرام چیزیں جیسے چوہا وغیرہ کھاتی ہیں، خرگوش نہیں کھاتا، بلی مردار کھاتی ہے، خرگوش مردار خور نہیں۔

زبان و اسلوب

قاضی صاحب کے فتاویٰ کی زبان آسان عام فہم اور سہل و شستہ ہوتی ہے، ایسی کہ کم پڑھا

لکھا آدمی بھی پڑھ کر بہ آسانی سمجھ لے، کاش! قاضی صاحب کے تمام فتاویٰ محفوظ ہوتے تو یقیناً وہ ایک بڑا سرمایہ ہوتا لیکن انہوں نے ایک مفتی سے زیادہ مفتی گر کا کام کیا اور ملک بھر میں کتنے ہی فضلاء جو اس وقت مسند افتاء کو سنبھالے ہوئے ہیں، ان کے تربیت یافتہ یا ان کے خرمین فکر کے خوش چیں ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر آیا، افسوس قاضی صاحب کے تمام فتاویٰ محفوظ نہیں رہ سکے، تاہم کچھ فتاویٰ دارالافتاء امارت شریعہ، پھلواری شریف کے ریکارڈ سے، کچھ سہ ماہی "بحث و نظر" کی فائل سے اور کچھ ان کے محفوظ خطوط کے ذریعہ جمع کئے گئے جن کی مجموعی تعداد تقریباً ۱۲۰ ہے، عزیز گرامی مولانا امتیاز احمد قاسمی سلمہ اللہ تعالیٰ (رفیق شعبہ علمی اسلامک فقہ اکیڈمی)۔ جنہیں حضرت قاضی صاحب سے استفادہ کا بھی خوب موقع ملا اور خدمت کا بھی۔ شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اولاً تو بہت محنت اور تلاش و جستجو سے ان فتاویٰ کو جمع کیا، پھر ان کو ابواب پر مرتب کرتے ہوئے مجموعہ کی شکل دی اور حسب ضرورت حوالہ جات کی تخریج کی، جہاں ضرورت تھی وہاں حواشی لکھے اور اس طرح اسلامک فقہ اکیڈمی کو یہ سعادت حاصل ہو رہی ہے کہ اپنے بائی کے افادات کا یہ مجموعہ وہ لوگوں تک پہنچائے، اس موقع پر جہاں مجھے اس بات پر مسرت ہے کہ اردو زبان میں فتاویٰ کے باب میں ایک نئے اور مفید مجموعہ کا اضافہ ہو رہا ہے وہاں اس بات پر خوشی و غم کا احساس بھی کہ صاحب فتاویٰ کی خواہش تھی کہ ان کے یہ فتاویٰ کتابی صورت میں مرتب ہو جائیں اور اس سلسلہ میں ابتدائی کوشش کے طور پر انہوں نے امارت شریعہ سے اپنے کچھ فتاویٰ کی نقل منگائی بھی تھی، لیکن خدا کی طرف سے یہ بات مقدر نہیں تھی کہ ان کی زندگی میں ان کا یہ خواب شرمندہ تعبیر ہو، چنانچہ یہ سعادت ہم لوگوں کے حصہ میں آرہی ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو ان کے لئے صدقہ جاریہ بنائے، اور اس کے افادہ کو عام و تمام فرمائے، نیز صاحب فتاویٰ کی بال بال مغفرت فرمائے، ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم۔

خالد سیف اللہ رحمانی

(جنرل سکرٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

☆☆☆

حضرت قاضی صاحب کا فقہی منہج

خود آپ کی تحریروں کی روشنی میں

(حضرت مولانا عتیق احمد بستوی)

اعتدال ایک پسندیدہ صفت ہے، خواہ کسی فرد میں ہو، یا کسی قوم میں، یا کسی مذہب میں۔ دنیا کا سارا نظام اعتدال و توازن پر چل رہا ہے، اعتدال و توازن سے استواری و پائیداری ہوتی ہے اور بے اعتدالی اور عدم توازن سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور نظام عالم درہم برہم ہونے لگتا ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اعتدال و توازن کی صفت خاصی کمیاب ہے، ایسے افراد خال خال ہی ملتے ہیں جو اپنی زندگی اور اعمال و افکار میں صفت اعتدال سے بہرہ ور اور راہ اعتدال پر گامزن ہوتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے انبیاء کی صفات و خصوصیات میں یہ بات بھی شمار کرائی ہے کہ ان کی تمام صفات میں اعتدال ہوتا ہے، حتیٰ کہ ان کی ذہانت میں بھی اعتدال ہوتا ہے، نہ وہ بلید اور کند ذہن ہوتے ہیں اور نہ حد سے بڑھی ہوئی ذہانت رکھتے ہیں۔

عام طور پر لوگوں میں (حتیٰ کہ علماء میں بھی) افراط و تفریط ہوتی ہے، تساہلی یا تشدد ہوتا ہے، معتدل و متوازن لوگ کم ہی ہوتے ہیں، جس کو قسام ازل کی طرف سے اعتدال و توازن کی دولت ملی اسے بہت بڑی چیز ہاتھ آئی۔

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب دور حاضر کے ان ربانی علماء میں سے تھے

جن کو اللہ تعالیٰ نے جامعیت کے ساتھ توازن و اعتدال کی صفت سے متصف فرمایا تھا، اسلامی شریعت پر انتہائی وسیع و عمیق نظر رکھنے کے ساتھ حالات زمانہ اور سیاسی و سماجی تبدیلیوں سے وہ پوری طرح آگاہ تھے، احکام شریعت کے مدارج سے بہ خوبی واقف تھے، مزاجی طور پر بھی معتدل و متوازن تھے۔

حضرت قاضی صاحب اور فقہ اسلامی

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کے اختصاص کا اصل میدان علم فقہ تھا، اللہ تعالیٰ نے انہیں فقہ فی الدین کی دولت بے بہا سے مالا مال فرمایا تھا، وہ فقیہ ہی نہیں بلکہ فقیہ النفس تھے، اسلامی شریعت کے اصول و مقاصد اور اسلام کے دستوری قوانین پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، دور حاضر کے مسائل کو کتاب و سنت اور فقہ سلف کی روشنی میں حل کرنے پر انہیں بڑی قدرت تھی، ان میں تخریج و استنباط کا زبردست ملکہ تھا، موصوف دور حاضر کے چند ممتاز ترین فقہاء میں سے تھے، دور حاضر میں اسلام کے عدالتی نظام کی تطبیق و تنفیذ میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

ان کے فقہی افکار و نظریات میں بھی بڑا اعتدال و توازن پایا جاتا ہے، مثلاً اجتہاد و تقلید کے مسئلہ کو لیجے جس کے بارے میں اچھے اچھوں کے یہاں افراط و تفریط پائی جاتی ہے، ایک گروہ تقلید کو شجر ممنوعہ قرار دے رہا ہے اور عالمان کم نظر ہی کو نہیں، بلکہ جاہلان بے بصیر کو بھی اجتہاد کا حق دینا چاہتا ہے اور ان مسائل کے بارے میں اجتہاد اور تبدیلی احکام کا داعی ہے، جن کے بارے میں کتاب و سنت کی صریح و قطعی نصوص موجود ہیں۔ دوسرا گروہ اس کے بالکل برعکس اتنی مضبوطی سے تقلید کا دامن تھامے ہوئے ہے کہ لفظ اجتہاد ہی سے لرزاں و ترساں ہے، اس کے نزدیک فقہاء متاخرین کی جزئیات و تخریجات بھی نص قطعی کا درجہ رکھتی ہیں، فقہاء کے جن مسائل کی بنا عرف اور حالات زمانہ پر ہے ان میں بھی وہ عرف اور حالات بدل جانے کے باوجود ادنیٰ ترمیم کے روادار نہیں ہیں۔

اجتہاد و تقلید کے ہنگامہ خیز مسئلہ میں ہمیں حضرت قاضی صاحب کے یہاں نقطہ اعتدال کی وکالت و ترجمانی نظر آتی ہے اور طاقتور انداز میں راہ اعتدال کی دعوت ملتی ہے، اجتہاد و تقلید کے موضوع پر ”اسلامی عدالت“ کے مقدمہ اور ”مباحث فقہیہ“ میں قاضی صاحب کی بحث بڑی بصیرت افروز اور فکر انگیز ہے، اس کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

اجتہاد

فقہ اسلامی ایک زندہ قانون ہے، جسے قیامت تک زندہ رہنا ہے، اس لیے اجتہاد کے ذریعہ احکام کی تخریج و استنباط کے قواعد و ضوابط فقہاء اسلام نے پوری طرح منضبط کر دیے ہیں اور صدیوں تک اسی قانون پر جدید سے جدید تہذیب و ثقافت کی بلند و بالا عمارت قائم رہی ہے اور ہمارا یقین ہے دنیا کے ہر سماجی و تہذیبی انقلاب کی رہنمائی کے لیے فقہ اسلامی کافی ہے۔

یہ بحث بہت عام ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے، اس میں غلط فہمی دونوں طرف ہے، متحد دین علماء اور فقہاء پر یہ الزام عاید کرتے ہیں کہ انہوں نے باب اجتہاد صدیوں سے مسدود کر دیا اور اس طرح اسلام عصر حاضر کا ساتھ دینے کا اہل نہیں رہا، دوسری طرف علماء میں ایک طبقہ اجتہاد کو واقعی ایسا ”شجر ممنوعہ“ سمجھتا ہے جس کا نام زبان پر لانا گناہ اور اجتہاد کا نام لینے والا مشکوک قرار پاتا ہے۔

حقیقت دونوں سے دور ہے، علماء نے یہ نہیں کہا کہ باب اجتہاد ہمیشہ کے لیے مسدود ہو چکا اور کسی خاص تاریخ تک اجتہاد جائز تھا اور اس کے بعد اجتہاد ممنوع ٹھہرا، اصل مسئلہ اجتہاد کا نہیں، صلاحیت اور اہلیت اجتہاد کا ہے، یعنی اگر دین قیامت تک کے لئے ہے تو باب اجتہاد بھی قیامت تک کھلا رہے گا، دشواری یہ ہے کہ افراد میں اجتہاد کی مطلوبہ اہلیت و صلاحیت مفقود ہوتی جا رہی ہے، پس اگر اجتہاد کا کام بند ہوا تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ علماء مفقود ہو گئے جو اجتہاد کے منصب پر اپنی اہلیت و صلاحیت کے ذریعہ فائز ہو سکتے تھے، ورنہ قاضی جس کا تقرر قیامت تک رہنا ہے، اس کے لئے اجتہاد کو شرط صحت، یا شرط اولیت قرار دینے کوئی معنی نہیں، علماء اصول کے مابین تو اس مسئلہ پر بحث رہی ہے کہ کوئی زمانہ ایسا ہو بھی سکتا ہے یا نہیں جو مجتہد سے خالی ہو، اس بحث کی تلخیص ڈاکٹر طیب خضریٰ نے اپنی کتاب ”الاجتہاد فیما لا نص فیہ“ میں کی ہے جس کا ذکر کر دینا فائدہ سے خالی نہیں ہوگا۔

ہم نے یہ مفصل بحث اس لیے نکل کر دی کہ مسئلہ کے مختلف پہلو سامنے آجائیں، ہمارے نزدیک ان واقعات اور حالات کی روشنی میں جو پچھلے طویل زمانہ سے پیش آرہے ہیں، یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ کسی زمانہ کا مجتہد سے خالی ہونا ممکن نہیں کہ واقعات و حالات اس نظریہ کا ساتھ نہیں دیتے، لیکن اتنی بات تو واضح ہے کہ اس قول کی بھی کوئی گنجائش نہیں، متاخرین میں کسی صاحب اجتہاد شخص کا پیدا ہونا ممکن ہے، حقیقت یہ کہ ذکاوت و فطانت اور ذہن رسا کی نعمت اللہ نے چھین نہیں لی ہے، وسائل اجتہاد اور علوم و معارف کے خزانوں تک رسائی، عہد متاخرین میں جس طرح آسان ہو گئی ہے، پہلے کبھی نہیں تھی، سلف کی محنت آج روزانہ مدفون کتب خانوں سے نکل کر اس تیزی کے ساتھ سامنے آ رہی ہے کہ جس کا پہلے تصور مشکل تھا اور ان عظیم علمی خزانوں کو دیکھ کر برکت کہنا پڑتا ہے "آخر جست الارض انقلعها" (سورہ زلزلہ ۲)، لیکن مسئلہ ذکاوت و فطانت کا ہے، نہ فہم صحیح کا، نہ وسائل علم کا اور نہ خزانہ علمی تک رسائی کا، اصل مسئلہ ہماری کوتاہ ہمتی کا ہے، مشاغل علمیہ سے گریز کا ہے، علم کی راہ میں شب بیداری کے فقدان کا ہے، فکر میں عدم توازن اور بے اعتدالی کا ہے، خوف آخرت اور امور دین میں احتیاط کی کمی کا ہے، ورع و تقویٰ کے فقدان کا ہے اور نتیجتاً اہلیت اجتہاد کے ناپید ہونے کا ہے اور اگر اہلیت اجتہاد مفقود ہو اور پھر اجتہاد کی اجازت دی جائے تو اس کا لازمی نتیجہ حدیث رسول ﷺ کے مطابق "ضلوا و اضلوا" (صحیح البخاری، کتاب العلم) (خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو گمراہ کیا) ہی ہو سکتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اجتہاد کے بہت سے مراتب ہیں، ضروری نہیں کہ سبھی مجتہدین اپنی سبھی صلاحیتوں میں مساوی ہوں، کم سے کم اور ضروری حد تک اہلیت اجتہاد موجود ہو تو پھر اس کے بعد اپنی اپنی محنت، صلاحیت اور اللہ کی عنایت سے مجتہدین میں فرق مراتب پیدا ہو سکتا ہے اور کسی کا علم کسی سے زیادہ ہو سکتا ہے، کہ "فوق کل

ذی علم علیہم" (سورہ یوسف ۶۱)، بعض وہ مجتہدین ہیں جنہوں نے اصول استنباط وضع کیے ہیں، مناجع فکر متعین کی ہیں، بعض وہ ہیں جو اصول میں مقلد ہیں، لیکن فروع کی تخریج اور جزئیات کے استنباط میں خود اجتہاد کرتے ہیں، بعض علماء ائمہ سے منقول مختلف اقوال و روایات میں انہیں کے قائم کردہ اصولوں کی روشنی میں کسی قول کو دوسرے قول پر، ایک روایت کو دوسری روایت پر ترجیح دیتے ہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ابو حنیفہ، ابو یوسف، محمد بن حسن، زفر بن ہذیل، عافیت بن یزید، الاودئی، مالک، شافعی، احمد بن حنبل، سفیان ثوری، ابن جریر، طبری، ابوثور، امام طحاوی، امام یو یطی اور اس درجہ کے لوگ تو ہر زمانہ میں نہیں پیدا ہوتے، لیکن خود فقال، ابن دقیق العید، عز بن عبدالسلام، قاضی خاں، برہان الدین مرغینانی اور علامہ کمال الدین ابن ہمام جیسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں، جن کے بارے میں بہت سے علماء کی رائے ہے کہ یہ حضرات صاحب اجتہاد تھے، اس آخری دور میں شاہ ولی اللہ دہلوی کی اہلیت اجتہاد سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟ اور اگر یہ ضروری نہیں کہ مجتہد اپنے مجتہد ہونے کا دعویٰ کرے تو اس آخری عہد اور ماضی قریب میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی اجتہادی صلاحیتوں اور ان کے مجتہدانہ فتاویٰ کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے، خیال رہے کہ مجتہد کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ سلف کی تحقیقات کی بساط الٹ کر اپنی طرف سے کوئی نئی بات کہہ دے تو مجتہد ہے، حضرت تھانوی نے جس طرح اپنے عہد کے پیچیدہ اور الجھے ہوئے پیش آمدہ مسائل کا حل کیا ہے، قواعد شرع پر جیسی ان کی گہری نگاہ ہے، اقوال سلف کی جس طرح وہ رعایت کرتے ہیں تاکہ خرق اجماع لازم نہ آئے، مناظ حکم پر جیسی ان کی نگاہ رہتی ہے اور فتویٰ میں جس شدت احتیاط اور ورع و تقویٰ کو وہ برتتے ہیں ان کی نادرہ روزگار شخصیت سلف کے فقیہ انفس علماء کی یاد دلاتی ہے، مجھے یہ احساس ہے کہ جو کان لفظ اجتہاد کو سننا گوارہ نہیں کرتے، انہیں میرا یہ کہنا بھی شاید پسند نہیں

آئے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے بعد حضرت تھانوی نے ہندوستان میں کاراجتہاد انجام دیا ہے، اگرچہ انہوں نے ہمیشہ اپنے کو مقلد کہا اور مقلد سمجھا اور ایسے کسی بھی قول سے پرہیز کیا ہے جس کی نظیر اقوال سلف میں نہیں ملتی ہو۔

اجتہاد - ایک نازک کام

یہ حقیقت ہے کہ اجتہاد ایک نازک ترین ذمہ داری ہے، کہ اگر ہر کس و ناکس کو اجتہاد کی اجازت دے دی جائے تو دین ایک کھیل بن کر رہ جائے گا، خواہشات نفس کی پیروی کی جائے گی "مصالح شرعیہ" اور "مقاصد تشریع" کو نظر انداز کر دیا جائے گا اور شریعت کے نزول کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا، کار اجتہاد کی نازک ذمہ داری اگر نااہل افراد، یا ایسے لوگوں کے حوالہ کر دی جائے تو جو خوف خدا سے خالی اور خشکی و تری میں بے محابا چلنے کا مزاج رکھتے ہیں تو یقیناً ہے کہ یہ اصول اجتہاد سے ناواقف اور اہلیت اجتہاد سے محروم لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے خود بھی گمراہ ہوں گے اور اللہ کی مخلوق کو بھی گمراہ کریں گے۔ آج کے عہد کی بڑی بد نصیبی یہ ہے کہ وہ لوگ جو مکان کی تعمیر سے لے کر معاشی مسائل تک اور پرائمری اسکول سے یونیورسٹی کی تدریس تک، یعنی زندگی کے ہر شعبہ میں مہارت، تربیت، تجربہ، تخصص (specialisation) کو ضروری تصور کرتے ہیں، وہ دین کے معاملہ میں ناکارہ شخص کو رائے دینے اور اجتہاد کرنے کا اہل سمجھتے ہیں اور دوسری بد قسمتی یہ ہے کہ آج جو لوگ "اجتہاد اجتہاد" کا نعرہ باواز بلند لگا رہے ہیں، ان میں اکثر وہی لوگ ہیں جو اس دور کے منکرات و فواحش اور اللہ کے دین کی حرمتوں کو اجتہاد کے مقدس نام پر محض اپنی خواہشات نفس کی تکمیل کے لیے حلال کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خواہشات نفس کی پیروی سے خود رسول اللہ ﷺ کو منع فرمایا ہے اور شریعت منزل من اللہ کو فیصلہ کی بنیاد بنانے کا حکم دیا ہے (مباحث فقہیہ ۸۵-۸۸-۸۹)۔

تلفیق اور تتبع رخص:

تلفیق کا مسئلہ بھی فقہ و اصول فقہ کے مشکل اور پیچیدہ مباحث میں سے ہے، تلفیق کی حقیقت کیا ہے؟ تلفیق کی کون سی شکلیں جائز ہیں اور کون سی ناجائز؟ تلفیق اور تتبع رخص میں کیا رشتہ ہے؟ تتبع رخص (رخصتوں کی تلاش) کیا ہر حال میں ممنوع ہے یا کچھ خاص شرطوں کے ساتھ اس کی گنجائش یا استحسان ہے؟ اس طرح کے مختلف نازک پہلوؤں پر حضرت قاضی صاحب کی بحث بہت فکر انگیز، معقول اور متوازن ہے، چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

فقہاء کی جو تصریحات ہم نے ذکر کی ہیں، ان سے واضح ہے کہ تلفیق کے مسئلہ میں علماء اصول اور حضرات فقہاء کے تین مذاہب ہیں:

اول: تلفیق مطلقاً جائز ہے۔

دوم: تلفیق مطلقاً ناجائز ہے۔

سوم: چند شرائط کے ساتھ تلفیق جائز ہے۔

اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ پہلا قول یعنی تلفیق کا مطلقاً جائز ہونا بہت خطرناک ہے، خاص کر ہمارے اس دور میں جس میں خواہشات کا غلبہ ہے اور ورع و تقویٰ کی کمی ہے اور اباحت پسندی اور لاقانونیت کا دور دورہ ہے، اگر ہم اس مذہب کو اختیار کریں تو شریعت کو معطل کرنا لازم آئے گا اور دین مذاق بن کر رہ جائے گا اور لوگ دین و شریعت کو کھلونا بنالیں گے، اس کے برعکس دوسرے مذہب کو اختیار کرنا یعنی تلفیق کو مطلقاً ناجائز قرار دینا باوجودیکہ یہ قرآن و سنت سے ثابت بھی نہیں ہے، اس دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے، کیونکہ اگر کسی ایک فقہی مذہب کے بالکلیہ پابند ہو کر رہ جائیں تو اس سے ایک طرف حرج اور تنگی لازم آئے گی اور دوسری طرف نئے فقہی مسائل کا مناسب حل پیش کرنے میں ہم کامیاب نہیں ہو سکیں گے، فقہی آراء میں اختلاف کا پایا جانا دراصل اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت اور سہولت ہے اور ان میں سے ہر مذہب کی بنیاد کتاب اللہ

اور سنت رسول اللہ پر ہے، لہذا اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ موجودہ زمانہ کے پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کرنے میں خواہ ان کا تعلق اقتصادیات سے ہو یا سیاسیات سے، یا ان کے علاوہ زندگی کے کسی اور میدان سے، ہم مختلف فقہاء اور مجتہدین کی آراء سے استفادہ کریں، خصوصاً جب کہ تتبع رخص کی نیت سے نہ ہو، بلکہ امت سے واقعتاً حرج اور تنگی کو دور کرنے کے لیے ہو۔

خلاصہ کلام یہ کہ وہ تلفیق ممنوع ہے جس کا مقصد واجبات و فرائض سے رہائی حاصل کرنا، خواہشات نفس کی پیروی اور محرّمات شرع کے ارتکاب کے لئے حیلہ جوئی ہو، لیکن صحیح مقاصد کے لئے درج ذیل شرائط کے ساتھ تلفیق جائز ہے۔

اول: تقلید کے طور پر جو عمل ہو چکا ہے، اس سے رجوع لازم نہ آئے، مثلاً ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: "انت طالق البتہ" تجھے قطعی اور یقینی طلاق ہے اور اس کی نیت اس سے تین طلاق کی ہے، پھر اس نے اس مسئلہ میں اپنی رائے کو نافذ کیا اور یہ یقین کر لیا کہ وہ عورت اس پر حرام ہو چکی ہے، پھر اس کی رائے یہ ہوئی کہ اس طلاق کو رجعی قرار دے کر اس سے رجعت کر لے اور اسے اپنی زوجیت میں باقی رکھے۔

دوم: یہ کہ اس سے اس کے لازم اجماعی (یعنی پہلے تقلید کے طور پر عمل کرنے کی وجہ سے جو صورت لازم آتی ہے) سے رجوع لازم نہ آتا ہو، مثلاً ایک شخص نے بغیر ولی کے نکاح کے صحیح ہونے میں امام ابو حنیفہ کی تقلید کی اور ایک بالغ لڑکی سے بلا ولی نکاح کر لیا تو اس میں شک نہیں کہ اگر نکاح کی صحت تسلیم کر لی جائے تو اس سے طلاق واقع کرنا بھی لازم صحیح ہوگا، تو اگر یہ شخص اپنی منکوحہ کو جس سے بغیر ولی کے نکاح کیا ہے تین طلاق دے دے، پھر طلاق واقع نہ ہونے میں امام شافعی کی تقلید کرنا چاہے (کہ امام شافعی کے مسلک کی رو سے یہ نکاح ہی صحیح نہیں ہوا، کیونکہ بغیر ولی کے تھا) تو ایسا اس کے لیے جائز نہ ہوگا، کیونکہ یہ سابق تقلید کے نتیجے میں لازم آنے والے لازم اجماعی حکم سے رجوع کرنا ہے۔

سوم: یہ کہ علماء کے نادر اور شاذ اقوال کو اختیار نہ کرے، کیونکہ علماء کے وہ نادر اور شاذ اقوال جنہیں امت نے مسترد کر دیا ہے اور قبول نہیں کیا ہے، انہیں اختیار کرنا جائز نہیں ہے، امام اوزاعی فرماتے ہیں: جو شخص علماء کے نادر اقوال کو اختیار کرے گا وہ اسلام سے نکل جائے گا، سلیمان تیمی کہتے ہیں: اگر تو ہر عالم کی رخصت اختیار کرے تو تجھ میں تمام برائیاں جمع ہو جائیں گی اور علماء کے شاذ و نادر سے مراد وہ اقوال ہیں جنہیں زلات (غزشیں) کہا جاتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر تلفیق اور تتبع رخص کو مطلقاً مباح قرار دیں تو یہ امت کے لئے فتنہ اور آزمائش بنیں گے، ہاں اگر قابل اعتماد فقہائے کرام دو جدید کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے اور امت سے حرج اور تنگی کو دور کرنے کے لئے ضروری شرائط کے ساتھ رخصت اور تلفیق کو اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کریں، تو میری رائے میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بالخصوص جب یہ کام علماء راہنہ کے اجتماعی اجتہاد کے نتیجے میں انجام پائے، واللہ اعلم، (مباحث فقہیہ ۱۳۱، ۱۳۲)۔

قول راجح

اس مسئلہ میں جس قول کی طرف میرا رجحان ہے، اس میں قدرے تفصیل ہے اور وہ یہ کہ تتبع رخص عام حالات میں تشکی، لہو و لعب اور خواہشات کی پیروی کی بنیاد پر ناجائز ہے، ہاں اگر کسی خاص مسئلہ میں عذر یا مرض کی ضرورت کی بنیاد پر ہو تو مخصوص شرائط کے ساتھ جائز ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ شریعت نے جہاں خواہشات کی اتباع اور لہو و لعب سے روکا ہے، وہیں دوسری طرف احکام میں سیر و سہولت کے پہلو کی رعایت کی ہے اور دین میں اللہ تعالیٰ نے کوئی تنگی نہیں رکھی ہے اور نبی ﷺ کو سیدھے اور آسان دین کے ساتھ بھیجا گیا ہے، لہذا اس مسئلہ میں ان دونوں پہلوؤں کی رعایت ضروری ہے اور میری سمجھ میں یہ آ رہا ہے (واللہ اعلم) کہ

وہ تتبع رخص جو ممنوع ہے اور جس کے ممنوع ہونے پر بعض حضرات نے اجماع کا دعویٰ کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان ہر مسلک میں سے اس قول کو اختیار کرے جو اس کے لئے آسان ہو اور یہ کسی واقعی عذر اور ضرورت کے پیش نظر نہ ہو، بلکہ محض خواہش نفس کی پیروی میں ہو، کیونکہ اگر اس کا دروازہ کھول دیا جائے تو یہ شریعت کے احکام سے آزادی حاصل کرنے کا ذریعہ بن جائے گا اور دین کھلونا اور مذاق بن کر رہ جائے گا، تتبع رخص کی اس قسم میں یہ صورت داخل ہے کہ انسان تشہی اور لہو و لعب کی غرض سے مختلف مسائل میں مختلف فقہاء کے اقوال اختیار کرے، مثلاً: ایک شخص نے کسی عورت کے ساتھ بدکاری کا ارادہ کیا، لیکن اسے اندیشہ ہوا کہ اس جرم کی بنیاد پر اس پر حد زنا قائم کی جائے گی، اس لئے اس نے ولی اور گواہ کے بغیر اس عورت سے شادی کر لی اور اس نے بالغ عورت کے نکاح کی صحت کے سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کے قول کو اختیار کر لیا جو بالغہ کے نکاح کے لئے ولی کی اجازت ضروری قرار نہیں دیتے اور گواہ کے بغیر نکاح صحیح ہونے کے سلسلہ میں امام مالکؒ کا قول اختیار کر لیا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تتبع رخص کی یہ صورت شریعت کے ساتھ کھیل اور مذاق ہے، جسے کوئی فقیہ تو کیا، کوئی صاحب عقل انسان بھی گوارہ نہیں کر سکتا، اور فقہاء عقل و دانش کے لحاظ سے تمام لوگوں سے فائق اور شریعت کے مقاصد سے سب سے زیادہ واقف ہیں، وہ بھلا اس کی اجازت کیوں کر دے سکتے ہیں اور جہاں تک خاص حالات میں رخص مذاہب سے استفادہ کی بات ہے، مثلاً زوج مفقود الخمر کے مسئلہ میں اور بعض دوسرے مسائل میں فقہاء حنفیہ نے امام مالکؒ کے قول کو اختیار کیا ہے، اسی طرح فقہاء شافعیہ نے فقہ مالکی اور فقہ حنفی کے بعض اقوال کو اختیار کیا ہے، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، کیونکہ اگر ہم ایک مجتہد کے قول پر عمل کو ضروری قرار دیں تو عصر حاضر کے مشکل اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنا ممکن نہ ہوگا، بالخصوص نئے تجارتی معاملات میں اور نہ یہ بات کسی طرح مناسب

ہوگی کہ ہر مکلف کو اس کی رخصت دی جائے کہ وہ اپنی زندگی کے مسائل میں اپنی خواہش کے مطابق جس قول کو چاہے اختیار کرے، یہاں تک کہ وہ ایک دن کسی مسئلہ میں امام شافعیؒ کے مسلک پر عمل کرے، اگر اس سے اس کی غرض پوری ہوتی نظر آئے اور پھر کل بعینہ اسی مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کا قول اختیار کر لے، کیونکہ دوسرے دن امام شافعیؒ کے قول پر عمل کرنے سے اس کا مقصد پورا نہیں ہو رہا ہے اور یہ بات مخفی نہیں کہ اتباع شریعت میں تکلیف ہوتی ہے اور مشقتوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے، لہذا شریعت کا کوئی حکم مشقت سے بالکل خالی نہیں ہو سکتا، بلکہ ہر حکم شرعی میں کچھ نہ کچھ مشقت ہے، ہاں ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں بناتا، پس حرج، مشقت اور تنگی کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں۔ مسئلہ کی نزاکت کے پیش نظر ضروری ہے کہ کسی بھی مسئلہ میں ائمہ کے اقوال میں آسان قول کو اختیار کرنے کے سلسلے میں کوئی ضابطہ مقرر کر دیا جائے، تاکہ تباہ کن اباحت پسندی اور دین سے متنفر کرنے والی تنگی دونوں کا سد باب ہو سکے، اس سلسلہ میں درج ذیل اصول کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے:

۱- "الأمر إذا ضاق اتسع" مشہور فقہی قاعدہ ہے، اس کی رو سے جب کسی مسئلہ میں تنگی پیدا ہوگی تو شریعت اس تنگی کو دور کر کے وسعت پیدا کرے گی، تو جب کسی مبتلی بہ کو کسی امر میں ایسی تنگی، حرج اور دشواری پیش آئے، جسے وہ برداشت نہیں کر سکتا تو ایسی صورت میں اس کے لئے جائزہ ہوگا کہ وہ کسی دوسرے امام کے قول کو اختیار کرے، جس میں دفع حرج و مشقت ہو۔

۲- لیکن اس صورت میں اس پر لازم ہوگا کہ وہ ان ارباب علم و ذکر اور اصحاب فتویٰ سے رجوع کرے، جو دین کا گہرا علم رکھتے ہوں اور ورع و تقویٰ کی صفت سے متصف ہونے سے دین کی اساس اور بنیاد سمجھ جاتے ہوں، تاکہ وہ خواہش نفس اور شیطان کے مکر و فریب کا شکار نہ ہو، کیونکہ ایک عام انسان بسا اوقات

ضرورت اور اجتماع ہونی کے درمیان فرق نہیں کر سکتا۔

۳- اس پر لازم ہے کہ ائمہ اربعہ کے مذاہب سے تجاوز نہ کرے، جو صدیوں سے مدون اور منسج صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں اور جن پر زمانہ قدیم سے عمل ہوتا چلا آ رہا ہے، کیونکہ ائمہ اربعہ کے علاوہ دوسرے فقہاء کے مذاہب جو فقہی کتابوں کے ذخیروں میں منقول و مذکور ہیں وہ عام طور پر ثقہ راویوں کی روایت سے مروی نہیں ہیں اور ثقہ علماء و فقہاء کی زبانی ہر دور میں تواتر کے ساتھ نقل نہیں ہوئے ہیں، اسی طرح وہ شرائط اور قیود بھی ہمیں معلوم نہیں ہیں، جو ان کے نزدیک معتبر رہی ہوں گی۔

۴- لیکن اگر مسئلہ عموم بلوی کی وجہ سے اجتماعی ہو گیا ہو یا ایسا معاملہ ہو جو حالات اور زمانہ کی تبدیلی، یا نئے عرف کی وجہ سے پیدا ہوا ہو، خاص طور پر لوگوں کے معاملات مثلاً تجارت، صنعت و حرفت اور تجارت، صنعت کا راولہل پیشہ کی عادات سے متعلق ہو، خصوصاً بین الاقوامی معاملات میں تو ایسی صورت میں علماء و آخنین اور اصحاب تقویٰ فقہائے کرام پر لازم ہے کہ وہ ان مشکلات اور پیچیدہ مسائل کا حل شریعت کے مقاصد اور قواعد کلیہ کی روشنی میں نئے حالات کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اجتماعی اجتہاد کے ذریعہ تلاش کریں اور ان کے لئے ائمہ ہدیٰ میں سے کسی ایک کے قول سے دوسرے کے قول کی طرف درج ذیل شرطوں کے ساتھ عدول کرنا جائز ہے:

۱- دوسرا قول شاذ نہ ہو۔

۲- نص سے نکرانا نہ ہو (مباحث فقہیہ ۱۲۸-۱۳۰)۔

شیخ احمد بستوی

(سکریٹری ہدائے علمی امور اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

عرض مرتب

میرے لیے بڑی خوش بختی اور توفیق خداوندی کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و عنایت سے برصغیر ہندوپاک کے مشہور فقیہ، عظیم محقق اور صاحب نظر عالم کے گرانقدر فتاویٰ کو ترتیب دینے اور ان میں یکسرے ہوئے علمی موتی کو یکجا لڑی میں پروانے کی توفیق بخشی، جو اس حقیر طالب علم کی علمی بساط سے بہت بلند و بالا چیز تھی۔

صاحب فتاویٰ "فقیہ العصر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی" (اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے) نے اپنی حیات ہی میں اس ناچیز پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے اس قیمتی علمی سرمایہ کو ترتیب دینے اور کتابی شکل میں پیش کرنے کی اجازت فرمائی تھی، ۲۰۰۰ء میں جب میں "المعبد العالی للتدرب فی القضاء والافتاء امارت شرعیہ، پٹنہ" سے تعلیمی سال مکمل کر کے فارغ ہوا تو مخدومی حضرت قاضی صاحب نے مجھے اور میرے رفیق درس مولانا سہیل اختر قاسمی (جو اس وقت دارالقضاء امارت شرعیہ میں ہیں) کو ایک مخطوطہ "فتاویٰ رحمانیہ" پر کام کرنے کا حکم فرمایا، اپنے مکان محلہ مہدولی، دربھنگہ میں ساتھ رکھ کر پورے رمضان المبارک کام کرنے کا طریقہ اور نچ بتایا۔ اسی اثناء میں نے حضرت قاضی صاحب سے درخواست کی کہ میں آپ کے فتاویٰ کو ترتیب دینا چاہتا ہوں، ان کی خوردنوازی تھی کہ انہوں نے مجھے اس کی اجازت عنایت فرمائی، چنانچہ دارالافتاء امارت شرعیہ سے رجسٹر منگوا یا گیا جو بہت بوسیدہ ہو چکا تھا، میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس میں سے

حضرت قاضی صاحب کے فتاویٰ کا زیر کس کرایا، پھر اسے حضرت قاضی صاحب کو دکھایا، آپ نے ان میں سے اہم اور نئے موضوعات پر مشتمل فتاویٰ کو اس میں شامل کرنے کے لیے صحیح کا نشان لگایا اور بعض کو چھوڑ دیا، اس طرح یہ کام اسی جگہ سے شروع ہوا جہاں آج آپ مدفون ہیں، پھر جب آپ دہلی تشریف لائے تو کام مزید کچھ آگے بڑھا، بحث و نظر اور اکیڈمی کے دارالافتاء سے حضرت کے فتاویٰ لیے گئے، لیکن درمیان میں دوسری مصروفیات کی وجہ سے ترتیب کا کام بالکل رک گیا، حضرت کی خواہش تھی کہ ان کے فتاویٰ ان کی زندگی میں شائع ہو جائیں، مجھے اس کا زندگی بھر قلق رہے گا کہ میں ان کی حیات میں اس کام کو مکمل نہ کر سکا، دراصل قادر مطلق کو یہی منظور تھا۔

یہ وہ فتاویٰ ہیں جو مجھے دستیاب ہو سکے، ورنہ ان کے علاوہ بھی آپ کے بہت سے فتاویٰ تھے جو یا تو محفوظ نہیں رہ سکے یا تلاش بسیار کے باوجود اس وقت دستیاب نہیں ہو سکے، اس کے دو اسباب ہیں: ایک تو یہ کہ شروع سے آپ کے فتاویٰ کو محفوظ رکھنے کا اہتمام نہیں کیا جاسکا، دوسرے یہ کہ آپ منصب قضا پر فائز رہنے کی وجہ سے فتویٰ پر اپنا دستخط کرنے میں احتیاط برتتے تھے، اس سلسلہ میں میں نے حضرت قاضی صاحب سے دریافت کیا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ اس وقت دارالافتاء میں کوئی متعین مشتی نہیں تھا، اس لئے بعض اوقات میں املا کر دیا کرتا تھا، لیکن اپنا دستخط نہیں کرتا تھا، ظاہر ہے کہ اب ان فتوؤں کی شناخت دشوار ہے، اس کے علاوہ ”افکار ملی“ میں بھی مسلسل ایک سال تک نئے مسائل پر آپ کے فتاویٰ سوال و جواب کی شکل میں شائع ہوتے رہے، افسوس کہ اس کا ریکارڈ محفوظ نہیں رہا اور تلاش کے باوجود نہیں مل سکا، اس لئے وہ بھی اس مجموعہ میں شامل نہ ہو سکے۔

ادھر جب چودھویں فقہی سمینار کی تاریخ کا اعلان ہوا تو جنرل سکریٹری مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، سکریٹری اکیڈمی مولانا امین عثمانی ندوی اور دوسرے ذمہ داران نے اس کام کو مکمل کرنے کی ہدایت فرمائی، اس طرح نئے سرے سے یہ کام شروع ہوا، پہلے مرحلے میں جنویب اور فہرست سازی کی گئی، عنوانات قائم کیے گئے، سوالات کی تصحیح کی گئی اور پھر عربی مآخذ سے حوالہ جات تلاش کیے گئے، بعض لمبی عربی عبارتوں کے ترجمے حاشیہ میں کیے گئے، متن میں بعض قدیم کتابوں کے صفحات درج تھے، ان کو بدل کر نئے ایڈیشن کے صفحات، مطبع وغیرہ کے ساتھ درج کیے گئے، اس

ناچیز نے اپنی حقیر صلاحیت کے مطابق یہ کوشش کی ہے، جس کا اصل مقصود حضرت الاستاذ کے ایک علمی ورثہ کی حفاظت ہے، کہاں تک اس میں کامیابی ملی ہے، اس کا فیصلہ تو مستقبل میں کریں گے، راقم کو اس کام میں غلطیوں اور کوتاہیوں سے انکار نہیں ہے، اگر کسی صاحب نظر کو کوئی غلطی نظر آئے تو براہ کرم اس سے مجھے مطلع فرمائیں، یہ اس حقیر مرتب کے لئے آپ کا احسان ہوگا۔

آج جبکہ ”فتاویٰ قاضی“ کا یہ مجموعہ کتابی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے، میں بے انتہا خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ باری تعالیٰ نے مجھ ناچیز سے اپنے ایک مقبول بندہ اور خود اس حقیر کے محسن و مخدوم کی نسبت سے یہ خدمت لی۔

اس موقع پر میں تمام ذمہ داران اکیڈمی کا شکر گزار ہوں، خصوصیت کے ساتھ صدر اکیڈمی حضرت مولانا محمد ظفر الدین صاحب مفتاحی دامت برکاتہم کا، کہ انہوں نے میری درخواست پر مبسوط ”مقدمہ“ تحریر فرمایا، نائب صدر اکیڈمی، صاحب نظر عالم دین، عربی ادب کے مشہور انشاء پرداز اور محقق حضرت مولانا بدر الحسن القاسمی کا، کہ انہوں نے ادنیٰ سی درخواست پر اپنی علمی مصروفیت کے باوجود بصیرت افروز اور چشم کشا ”پیش لفظ“ تحریر فرمایا، سکریٹری جنرل حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی کا کہ انہوں نے نہ صرف حضرت قاضی صاحب کے فتاویٰ کی خصوصیات تحریر فرمائی، بلکہ پورے مسودہ کو وقت نظر سے دیکھا، حاشیہ میں کچھ حذف و اضافہ کی ہدایت بھی فرمائی، سکریٹری برائے علمی امور حضرت مولانا شعیب احمد صاحب بستوی کا، کہ انہوں نے بھی حضرت قاضی صاحب کے فقہی منہج پر اپنی تحریر عنایت فرمائی، اس کے ساتھ ساتھ شعبہ علمی اور شعبہ کمپیوٹر کے ان تمام رفقاء کا جنہوں نے جگہ جگہ اس کام میں میرا تعاون فرمایا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ صاحب فتاویٰ کی بال بال مغفرت فرمائے، اس حقیر خدمت کو قبول فرمائے اور لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اس سے استفادہ کا موقع عطا فرمائے، آمین، ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم۔

احتیاز احمد قاسمی

(رشتہ شعبہ علمی اسلامک فکڈ اکیڈمی انڈیا)

بروز شنبہ، ۵ جون ۲۰۲۲ء

کتاب الطہارۃ

بغیر عذر شرعی تیمم کرنے کا حکم

کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے یہاں ماسٹر صاحب امام ہیں، وہ غسل نہیں کرتے ہیں اور وضو بھی کبھی کبھی کرتے ہیں، بلکہ اس کے بدلے عام طور پر تیمم کر لیتے ہیں، جبکہ ان کو کوئی عذر شرعی بھی نہیں ہے، کیا ایسے امام کے پیچھے نماز ادا کرنا صحیح ہے؟ نیز اس کی اور دوسرے مقتدیوں کی نماز ایسی حالت میں ہو جائے گی؟

الجواب وبالله التوفیق

اگر بغیر عذر شرعی ماسٹر صاحب تیمم کرتے ہیں تو نہ ان کی نماز صحیح ہوتی ہے اور نہ ان کی اقتداء کرنے والوں کی، اور اگر وہ کبھی بھی غسل نہیں کرتے اور وضو نہیں کرتے ہیں اور ان کے پاس کوئی عذر شرعی بھی نہیں ہے تو بہت بڑا گناہ اور بہت دور تک پہنچانے والا ہے (أَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ)۔ ایسی صورت میں جبکہ بظاہر وہ معذور نہیں ہیں اور پھر بھی تیمم کر کے نماز پڑھتے ہیں اور اپنے خیال میں اپنے کو معذور سمجھتے ہیں تو انہیں ان کے اپنے حق میں چھوڑ دیا جائے، لیکن انہیں امامت برگز نہیں کرنی چاہئے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

فَسْأَلُوا
أَهْلَ الذِّكْرِ
إِنْ كُنْتُمْ
لَا تَعْلَمُونَ

(سو اگر تم لوگوں کو علم نہیں تو
اہل علم سے پوچھ دیکھو)

کتاب الصلاۃ

باب العیدین

کیا تکبیر تشریق کے الفاظ حدیث سے ثابت ہیں؟

مدرسہ وصیت العلوم کے ایک مفتی صاحب سے سہارنپور میں ملاقات ہوئی تھی، ان کا نام مجھے یاد نہیں رہا، انہوں نے ایک سوال کیا تھا، فوری طور پر میرے ذہن میں نہیں تھا، میں نے آکر فوری طور پر چند کتابیں دیکھیں، جن سے واضح ہوا کہ تکبیر تشریق کے الفاظ نہ صرف ثابت ہیں، بلکہ دارقطنی میں مروی حضرت جابر کی مرفوع روایات میں سے ایک روایت کے الفاظ ہیں: "روی جابر أن النبي ﷺ صلى الصبح يوم عرفة وأقبل علينا فقال: "الله أكبر الله أكبر" ومدّ التكبير إلى العصر من آخر أيام التشريق"، أخرجه الدار قطنی من طرق، وفي بعضها: "الله أكبر الله أكبر، لا إله إلا الله والله أكبر والله الحمد" (۱)۔

موسوع عمر بن الخطاب میں تکبیر تشریق کے الفاظ یہ ہیں: "الله أكبر الله أكبر، لا إله إلا الله والله أكبر، الله أكبر والله الحمد" (۲)۔

موسوع عبد اللہ بن مسعود میں ہے: "صيغة تكبير التشريق التي كان يكبرها ابن مسعود هي: الله أكبر الله أكبر، لا إله إلا الله، الله أكبر، الله أكبر والله الحمد" (۳)۔

المغنی میں ہے: "وصفة التكبير: الله أكبر الله أكبر، لا إله إلا الله والله أكبر

(۱) المغنی ۲/۲۳۶ طبع دار الفکر بیروت۔

(۲) موسوع عمر بن الخطاب ۲/۲۰۷۔

(۳) موسوع عبد اللہ بن مسعود ۱۳۸ بحوالہ ابن ابی شیبہ ۱/۸۴، المغنی ۵/۹۱، المجموع ۵/۲۵۵، المغنی ۲/۲۹۳۔

الله أكبر والله الحمد، وهذا قول عمر وعلي وابن مسعود، وبه قال الثوري وأبو حنيفة وإسحاق وابن المبارك" (۱)۔

موسوع علی بن ابی طالب میں ہے: "صيغة التكبير التي يلتزمها في تكبير التشريق هي: الله أكبر الله أكبر، لا إله إلا الله والله أكبر الله أكبر والله الحمد" (۲)۔

غرض یہ کہ آثار صحابہ اور بعض روایات مرفوعہ سے ان الفاظ کا ثبوت ملتا ہے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱) المغنی ۲/۲۳۷ طبع دار الفکر بیروت۔

(۲) موسوع علی بن ابی طالب ۱/۱۵۳ بحوالہ ابن ابی شیبہ ۱/۸۳، مسند زید ۲/۳۳۳، کنز العمال ۱۲/۷۵۳۔

باب القراءة

فاتحہ اور سورہ کے درمیان بسم اللہ پڑھنا کیسا ہے؟

۵۔ جمادی الاول ۱۳۸۳ھ کو تیب میں اسلامی مسائل کے عنوان سے جو فتویٰ شائع ہوا ہے، اس میں سے ایک مسئلہ کہ فاتحہ اور سورہ کے درمیان بسم اللہ پڑھنا بہتر اور مستحب ہے، عام کتب فقہ اور فقہاء احناف کے قول کے خلاف معلوم ہوتا ہے، ذیل میں بعض حوالے ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ عالمگیری میں ہے: "ولا يسمى بين الفاتحة والسورة هكذا في الوقاية والنقاية هو الصحيح هكذا في البدائع والجوهرية النيرة" (الفتاوى الهندية، باب صلاة الصلاة ۱/ ۷۳)۔

۲۔ اور خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے: "لا يأتي الإمام بالتسمية بين الفاتحة والسورة" (خلاصۃ الفتاویٰ ۱/ ۵۳)۔

۳۔ شرح النقایہ جلد اول میں ہے: "ولا يسمى بين الفاتحة والسورة"۔
۴۔ "وتسنن التسمية في أول كل ركعة قبل الفاتحة" (مراقي الفلاح علی الطحاوی ۱/ ۱۴۱)۔

۵۔ حنفیہ کی مشہور کتاب شرح وقایہ میں ہے: "ويسمى لا بين الفاتحة والسورة" (شرح الوقایہ، باب صلاة الصلاة ۱/ ۱۳۵)۔

۶۔ غنیۃ المستملیٰ میں ہے: "وأما الموضع الثالث ففي رواية عن أبي حنيفة أن محلها أول الصلاة والصحيح أن محلها أول كل ركعة عند أصحابنا جميعاً لا خلاف فيه" (کبریٰ ۱/ ۳۰۷)۔

اس بحث سے متعلق آگے صفحہ ۳۰۸ پر تحریر فرماتے ہیں: "وأما التسمية عند ابتداء السورة بعد الفاتحة فإنه عند أبي حنيفة لا يأتي بها لا في

حالة الجهر ولا في المخافتة وكذا عند أبي يوسف لما تقدم أنها ليست بآية من أول السورة والإتيان بها في أول ركعة لما تقدم من الأحاديث الدالة على أنه عليه السلام كان يأتي بها سرا وكذا الخلفاء الراشدون" (کبریٰ)۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب مبسوط میں ہے: "وروي المعلى عن أبي يوسف عن أبي حنيفة أنه يؤتي بها في أول كل ركعة وهو قول أبي يوسف وهو أقرب إلى الاحتياط لاختلاف العلماء والآثار في كونها آية من الفاتحة، وروي ابن أبي رجاء عن محمد رحمه الله تعالى أنه قال: إذا كان يخفي القراءة لا يأتي بالتسمية بين السورة والفاتحة، لأنه أقرب إلى متابعة المصحف وإذا كان يجهر لا يأتي بها بين السورة والفاتحة، لأنه لو فعل لا خفي بها فيكون ذلك سكتة له في وسط القراءة ولم ينقل ذلك مأثوراً" (مبسوط السرخسی ۱/ ۱۶)۔

علامہ شامی کی عبارت جس سے تسمیہ بین الفاتحہ والسورہ پر استدلال کیا گیا ہے، مختصر ہے، پوری عبارت اس طرح ہے، درمختار میں ہے: "لا تسنن بين الفاتحة والسورة مطلقاً"۔

اس کی شرح علامہ شامی اس طرح کرتے ہیں: "(قوله لا تسنن) مقتضى كلام المتن أن يقال لا يسمى لكنه عدل عنه لإيهامه الكراهة بخلاف نفي السنية، ثم إن هذا قولهما وصححه في البدائع وقال محمد تسنن إن خافت لا إن جهر (بحر) وذكر في المصنف أن الفتوى على قول أبي يوسف أنه يسمى في أول كل ركعة وفي رواية حسن ابن زياد أنه يسمى في الركعة الأولى لا غير، وإنما اختير قول أبي يوسف لأن لفظة الفتوى أكد وأبلغ من

لفظة المختار، ولأن قول أبي يوسف وسط وخير الأمور
أوسطها، كذا في شرح عمدة المصلي (رد المحتار ۲/۱۹۲)۔

فقہاء کی ان تصریحات کے بعد بسم اللہ پڑھنے کو الحمد و سورہ کے درمیان مستحب
کہنا سمجھ میں نہیں آتا۔ ورجحه المحقق ابن الہمام وتلمیذہ الحلبي
لشبهة الاختلاف في كونها آية من كل سورة۔

اس کا جواب کبیری میں دیا ہے، اس کو بھی ملاحظہ فرمائیں: "واعترض الشيخ
كمال الدين بن الهمام بأن مقتضى هذا أن يؤتى بها مع السورة
لثبوت الخلاف في كونها من كل سورة كما في الفاتحة"۔

اعترض نقل کر کے خود اس کا جواب بھی دیتے ہیں: "والجواب أن الخلاف
أنها آية من السورة ليس في القوة كالخلاف في أنها آية من الفاتحة
على ما مر فلا يؤثر في ثبوت الاحتياط كتأثيره" (کبیری ۲۰۷)۔

اب اخیر میں افتاء کے بعض اصول و قاعدہ کے پیش نظر امام محمدؒ اور شیخین کے اس
اختلافی مسئلہ کو دیکھیں اور فیصلہ کریں۔

قال في الفتاوى السراجية: "ثم الفتوى على الإطلاق على قول أبي
حنيفة ثم قول أبي يوسف ثم قول محمد ثم قول زفر والحسن ابن
زياد" (شرح مقود رسم المفتی ۱۹)۔

اور صفحہ ۲۰ پر لکھتے ہیں: "ولذا قال الإمام قاضي خان وإن كانت
المسألة مختلفاً فيها بين أصحابنا فإن كان مع أبي حنيفة
أحد صاحبيه يأخذ بقولهما أي بقول الإمام ومن وافقه" (شرح
مقود رسم المفتی ۲۰)۔

مقود رسم المفتی میں اس کی تصریح موجود ہے کہ صحیح، أصح، الأظهر،
الأوجه، المختار، أكد، المؤكد، بہ یفتی اور علیہ الفتویٰ میں بہ

یفتی اور علیہ الفتویٰ سب سے زیادہ صحیح قول ہے، جیسا کہ ابھی علامہ شامی کی
عبارت گذر چکی کہ لفظ "فتویٰ" آکد و ابلغ ہے لفظ مختار سے۔ پوری عبارت مقود
رسم المفتی کی اس طرح ہے:

"وحيثما وجدت قولين وقد صحح واحد فذاك المعتمد بخود
الفتوى عليه الأشبه والأظهر المختار وذا الأوجه أو الصحيح
والأصح أكد منه وقيل عكسه المؤكد كذا به يفتى عليه الفتوى
وذا من جميع تلك أقوى" (شرح مقود رسم المفتی ۳۱، ۳۲)۔

ان تمام مذکورہ بالا عبارات کی روشنی میں مجھے اس مسئلہ سے اختلاف ہے کہ بسم
اللہ بین الفاتحہ و السورہ مستحب اور بہتر ہے، اس لئے ان عبارتوں اور فقہاء کی
تصریحات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی رائے عالیہ اور فیصلہ سے مستفیض فرمائیں۔

الجواب وبالله التوفيق

زیر بحث مسئلہ کی نوعیت یہ ہے کہ عالمگیری نے "لا یسمى الخ"، اسی طرح خلاصہ نے

"لا یأتی الإمام بالتسمیة الخ"، وقایہ اور نقایہ نے "لا یسمى بین الفاتحة والسورة
الخ" اور کبیری نے "عند أبي حنيفة لا یأتی بها" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ درمختار اور شامی
کے الفاظ پر اگر آپ غور کریں تو یہ محسوس کریں گے کہ ان تمام الفاظ مذکورہ کا اصل مفاد یہ ہے کہ شیخین
کے مسلک پر تسمیہ بین الفاتحہ و السورہ مسنون نہیں ہے، پس ان تمام الفاظ کا مفاد نفی سنیت ہے،
اثبات کراہت نہیں۔ اور چونکہ الفاظ مذکورہ سابقہ میں ایہام کراہت کا تھا، اسی لئے درمختار نے اس
طرز تعبیر سے عدول کر کے "لا یسمی بین الفاتحة والسورة" کے الفاظ استعمال کئے، اور شامی
نے اس بات کو ان الفاظ میں واضح کر دیا: "مقتضى كلام المتن أن يقال لا یسمى لكنه
عدل عنه لإيهامه الكراهة بخلاف نفی السنية" (۱)۔

تفصیل مذکورہ بالا کی روشنی میں یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اصل اختلاف شیخین اور امام محمد کے درمیان تسمیہ بین الفاتحہ والسورہ کے بارے میں سنیت اور نفی سنیت کا ہے۔ پس شیخین اس مقام پر یہ کہتے ہیں کہ بسم اللہ پڑھنا سنت نہیں اور حضرت امام محمدؒ سری نماز میں سنیت کے قائل ہیں۔ یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ جس قدر بھی دلائل شیخین کی طرف سے قائم کئے گئے ہیں، اس کا مقصد نفی سنیت کا اثبات ہے نہ کہ اثبات کراہت۔ پس جب یہ بات واضح ہوگئی کہ امام صاحب کا مسلک زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ تسمیہ بین الفاتحہ والسورہ سنت نہیں ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تسمیہ مکروہ بھی ہو، یا حسن نہ ہو، بلکہ عدم کراہت متفق علیہ ہے، بحر میں پڑھئے: "والخلاف فی الاستئذان اما عدم الکراہۃ فمتفق علیہ" (۱)۔

رہی یہ بحث کہ تسمیہ بین الفاتحہ والسورہ حسن ہے یا نہیں؟ تو ذخیرہ اور مجتہبی کی اس تصریح پر نگاہ رکھئے کہ ان کے خیال میں نماز سری ہو یا جہری امام صاحب کے نزدیک تسمیہ بین الفاتحہ والسورہ حسن ہوگا۔ "ولذا صرح فی الذخیرۃ والمجتبیٰ بانه ان سمي بين الفاتحة والسورة كان حسناً عند أبي حنيفة سواء كانت تلك السورة مقروءة سرّاً او جهراً" (۲)۔

تسمیہ بین الفاتحہ والسورہ کے حسن ہونے کو محقق ابن ہمام اور ان کے شاگرد حلبی نے رائج قرار دیا ہے، خیال رکھئے سنت ہونے کو نہیں، حسن ہونے کو اور اس پر یوں استدلال کیا ہے کہ تسمیہ ہر سورہ کا جز ہے یا نہیں؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے، اگرچہ اس میں رائج قول ہمارے نزدیک عدم جزئیت کا ہے، لیکن اختلاف علماء کی وجہ سے جزئیت کا شبہ ضرور پیدا ہو جاتا ہے، اس لئے تسمیہ کا پڑھ لینا حسن ہوگا، اگرچہ تسمیہ کے جزء فاتحہ ہونے کے بارے میں جو اختلاف ہے وہ اختلاف جزئیت سورہ سے زیادہ قوی ہے اور اسی لئے یہ شبہ جو جزئیت سورہ میں پیدا ہوا ہے اس شبہ سے کمزور ہے، جو جزئیت فاتحہ میں ہے اور اس اختلاف کے قوی ہونے کی وجہ سے اور نقل روایات سے مؤید ہونے کی

(۱) البحر الرائق ۳۳۰ طبع دار المعرفہ بیروت۔

(۲) البحر الرائق ۳۳۰ طبع دار المعرفہ بیروت۔

وجہ سے وہاں سنیت کا قول اختیار کیا گیا اور بعض مشائخ وجوب عملی کے قائل ہوئے اور یہاں بین الفاتحہ والسورہ صرف قول حسن پر اکتفا کیا گیا۔

ورجحه المحقق ابن الهمام وتلميذه الحلبي لشبهة الاختلاف في كونها آية من كل سورة وإن كانت الشبهة في ذلك دون الشبهة الناشئة من الاختلاف في كونها آية من الفاتحة" (۱)۔

کبیری کی پوری عبارت میرے سامنے نہیں ہے، لیکن جو عبارت آپ نے نقل کی ہے وہ یوں ہے: "والجواب أن الخلاف في أنها آية من السورة ليس في القوة كالخلاف في أنها آية من الفاتحة على ما مر فلا يؤثر في ثبوت الاحتياط كتأثيره" (۲)۔

آپ خود غور کر لیں اس عبارت کا زیادہ سے زیادہ یہ مفاد ہو سکتا ہے کہ جزئیت سورہ میں جو شبہ ہے وہ جزئیت فاتحہ کے شبہ سے کمزور ہے، اور نتیجتاً ثانی الذکر میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ حکم میں اس قوت وضعف کا پورا پورا لحاظ کیا گیا ہے، پس محقق ابن ہمام کے جواب میں کبیری نے جو کچھ لکھا ہے وہ خود محقق کی کہی ہوئی بات دہرائی گئی ہے۔ "وإن كانت الشبهة في ذلك دون الشبهة الناشئة من الاختلاف في كونها آية من الفاتحة" (۳)۔

اور ملا علی قاری نے شرح نقایہ میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے: "أقول والأظهر أن يقرأها سرّاً ولو في الجهرية لأنها للفصل بين السورتين ولا مانع من السكتة في وسط القراءة كما سيأتي في قوله آمين سرّاً" (۴)۔

عبارت مذکورہ کے آخری جملوں سے مبسوط السرخسی کی سکتہ والی علت کا جواب بھی

(۱) البحر الرائق ۳۱۲ طبع کوئٹہ پاکستان۔

(۲) کبیری ۳۰ طبع سہیل اکیڈمی لاہور پاکستان۔

(۳) البحر الرائق ۳۱۲ طبع کوئٹہ پاکستان۔

(۴) شرح نقایہ ۱۲۹۱۔

ہو گیا، غالباً یہی وہ دلائل ہیں جن کے پیش نظر مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ نے لکھا ہے کہ عبارت در مختار: "لا تسن بین الفاتحة الخ" کا حاصل یہ ہے کہ ابتداء سورت میں بسم اللہ پڑھنا نہ مسنون ہے اور نہ مکروہ ہے اور محققین نے اس کو رائج فرمایا ہے کہ پڑھنا بہتر اور مستحب ہے، شامی میں ہے: "ولذا صرح فی الذخيرة الخ" (۱)۔

اور حضرت تھانویؒ نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے: "حاصل مسئلہ اولیٰ کا یہ ہے کہ گو بسم اللہ ہر سورہ کا جز نہ ہو مگر باوجود عدم جزئیت روایت اس کا پڑھنا ہر سورہ پر منقول ہے، پس اگر کوئی شخص ہر سورہ پر نہ پڑھے تو اس کی قرأت اس روایت کے موافق نہ ہوئی، گو کوئی جز متروک نہ ہوا ہو، جب کہ کم از کم ایک سورہ پر پڑھ لے۔ اور دوسرے مسئلہ کا حاصل یہ ہے کہ گو روایت ہر سورت پر بسم اللہ منقول ہو، لیکن ہر سورہ کا جز نہیں ہے، بلکہ جز مطلق قرآن کا ہے، اگر ایک جگہ بھی پڑھ لے تو قرآن پورا ختم ہو جائے گا، گو اس روایت کے موافق اس کی قرأت نہ ہو۔ پس امام عاصمؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے قول میں کوئی تخالف نہیں، کیونکہ دونوں کی نفی اور اثبات کی حیثیتیں جدا جدا ہیں، اور حیثیات کے بدلنے سے تعارض جاتا رہتا ہے، یہ جب ہے کہ ہر سورت پر بسم اللہ نہ پڑھے اور اگر پڑھ لے تو شبہ کی گنجائش ہی نہیں، اور امام صاحبؒ کے بھی خلاف نہیں، کیونکہ امام صاحب تسمیہ کو ہر سورت پر ضروری نہیں کہتے، یہ نہیں کہ جائز نہیں کہتے، در مختار یا رد المحتار میں ہر سورہ پر تسمیہ کو حسن کہا ہے" (۲)۔

اس تفصیل کے بعد امید ہے کہ صورت مسئلہ آپ کے سامنے واضح ہو چکی ہوگی اور یہ بات بھی آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ تسمیہ بین الفاتحہ والسورہ کے حسن ہونے کا قول جو اختیار کیا گیا ہے ایسا نہیں ہے کہ اس میں امام صاحبؒ کے قول کو مرجوح قرار دے کر امام محمدؒ کے قول کو اختیار کر لیا گیا

(۱) فتاویٰ دارالعلوم قدیم ۱۰۰/۱۔

(۲) امداد الفتاویٰ ۱/۳۶۱، ۳۶۲ طبع جدید دیوبند۔

ہو، تاکہ اصول افتاء کی اس بحث میں الجھنا پڑے جو رسم المفتی سے آپ نے نقل کی ہے، اور اسی طرح علیہ الفتویٰ وهو المختار، اکد اور غیر اکد ہونے کی بحث بھی یہاں نہیں پیدا ہوتی، جس کے لئے آپ نے عقود رسم المفتی کی عبارت نقل کی ہے، پھر اس بات کا خیال رکھئے کہ آپ کے پیش کردہ سارے دلائل نفی سنیت کو مفید ہیں، نفی حسن کو نہیں، لہذا آپ کا یہ کہنا کہ "مجھے اس مسئلہ سے اختلاف ہے کہ بسم اللہ بین الفاتحہ والسورہ مستحب اور بہتر ہے" قابل غور ہے فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

جماعت کی نماز ہو جانے کے بعد آنے والا سری قرأت کرے گا یا جہری؟

فرض باجماعت ختم ہو جانے کے بعد آنے والا شخص اس نماز کو کسی طرح ادا کرے گا جہر کے ساتھ یا سر کے ساتھ؟

الجواب وباللہ التوفیق

اگر نماز جہری ہو یعنی مغرب، عشاء اور فجر تو آہستہ سے پڑھنا اور آواز کے ساتھ پڑھنا۔ دونوں جائز ہے، لیکن آواز کے ساتھ پڑھنا افضل ہے، مگر اتنی بلند آواز سے نہ پڑھے کہ دوسروں کی نماز میں خلل ہو (۱)۔

(۱) "وان كان منفرداً فهو مخير ان شاء جهراً أو سراً لانه إمام في حق نفسه وإن شاء خافت لانه ليس خلفه من يسمعه والأفضل هو الجهراً ليكون الأداء على هيئة الجماعة" (الهداية فصل في القراءۃ ۱/۳۶۱، ۳۶۲ طبع پاکستان)۔

باب النوافل

تہجد کی نماز باجماعت پڑھنے کا حکم

- (۱) تہجد کی نماز سنت ہے یا نفل؟
- (۲) تہجد کی نماز باجماعت شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟
- (۳) صرف شب برأت یا شب قدر ہی میں تہجد کی نماز باجماعت پڑھنا کیسا ہے؟
- (۴) تمام لوگوں کو دعوت دے کر بلا کر باضابطہ اعلان کر کے مسجد میں تہجد کی نماز باجماعت پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز رسول اکرم ﷺ اور صحابہ و تابعین سے ایسا طریقہ ثابت ہے یا نہیں؟
- (۵) جس مسجد میں پہلے سے شب برأت، شب قدر میں تہجد کی نماز باجماعت سے ہوتی آ رہی ہو، اب اگر امام اور بیگناہ نمازی کے اکثر افراد جماعت سے پڑھنا صحیح نہ سمجھتے ہوں تو وہاں اس طریقہ کو بند کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟
- (۶) اگر کچھ عوام یا کچھ مقتدی یا کچھ ذمہ داران مسجد امام کو اس بات پر مجبور کر دیں کہ تہجد کی نماز باجماعت پڑھانا ہوگا، تو ایسی شکل میں امام کو کیا کرنا چاہئے؟
- (۷) تہجد کی نماز باجماعت پڑھنے اور نہ پڑھنے دو شکلوں میں اندیشہ اختلاف وقتہ ہو تو کیا کیا جائے؟
- (۸) تہجد کی نماز باجماعت نہ پڑھنے والے کو برا بھلا کہنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب وبالله التوفیق

تہجد کی پابندی حضور اقدس ﷺ نے فرمائی، تہجد کی نماز عام مسلمانوں کے لئے مسنون ہے (۱) نفل کا لفظی معنی "زائد" ہے، کبھی فرض سے زیادہ کو نفل کہتے ہیں، اس طرح تمام ہی سنن کو نفل

(۱) "ومن الليل فتہجد به نافلة لك" (سورہ اسراء ۷۹) عن ابن عباس قال: كان النبی ﷺ إذا قام من الليل یتہجد۔ (صحیح البخاری مع فتح الباری ۳/۳۳) وقد اجتمعوا إلا شدوا من القدماء علی

کہا جاتا ہے۔ کبھی نفل کا لفظ سنن غیر مؤکدہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، جنہیں سنن زوائد یا مندوبات بھی کہتے ہیں (۱)۔ تہجد کی نماز ہو یا کوئی اور نماز جو فرض نہیں ہے، اس کے لئے جماعت کا اہتمام اور تداعی (بلا کر اور اعلان کر کے سنن و نوافل کو باجماعت ادا کرنا) مکروہ ہے، چاہے وہ شب برأت ہو یا کوئی اور رات، اس لئے بلاشبہ پورے سال میں کوئی بھی رات ہو تہجد کی نماز ہو یا کوئی اور نفل نماز اس کے لئے تداعی اور جماعت کا اہتمام درست نہیں ہوگا، ویسے کوئی اپنی نماز تہجد پڑھ رہا ہو اور اس کے پیچھے ایک دو آدمی شریک ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے (۲)۔

۱- رہا مسئلہ رمضان کا تو اس بارے میں فقہاء کی تصریح یہ ملتی ہے کہ رمضان میں وتر اور نوافل و تطوعات باجماعت اہتمام کے ساتھ پڑھی جاسکتی ہے، اب بعض علماء کی رائے عام اصول کے پیش نظر یہ ہے کہ یہاں نوافل و تطوع سے مراد صرف تراویح ہے، دیگر علماء کی رائے یہ ہے کہ اس میں تہجد بھی شامل ہے، اس لئے بعض اکابر علماء کا معمول رمضان میں تہجد کی نماز باجماعت ادا کرنے کا رہا ہے، علماء کا اختلاف رحمت ہے، اس لئے ہمارے لئے دونوں راہیں کھلی ہیں، چاہے رمضان میں تہجد کی نماز باجماعت ادا کریں یا تنہا تنہا (۳)۔

ان صلاة الليل ليست مفروضة على الأمة۔ وروی الطبری عن ابن عباس "ان النافلة للنبي ﷺ خاصة، لانه امر بقيام الليل وكتب عليه دون امته" (فتح الباری ۳/۳۳ طبع دار المعرفہ بیروت)۔
(۱) "السفل والنافلة: ما كان زيادة على الأصل" (لسان العرب ۱۳/۲۳۵ طبع بیروت)، اور ثامی میں ہے: "ففي الشريعة: زيادة عبادة شرعت لنا لا علينا" (رد المحتار ۲/۳۳۸)، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: رد المحتار باب سنن الوضوء، باب المکر وہات ۲/۳۳۸، ۳۳۹۔

(۲) "ولا يصلي الوتر ولا (التطوع بجماعة خارج رمضان) أي يكره ذلك لو على سبيل التداعي بأن يقتدي أربعة بواحد" (الدر المختار علی ہاشم رد المحتار ۱/۲۶۷ طبع احیاء التراث العربی بیروت)۔

(۳) در مختار اور رد المحتار کی سراحات سے یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ نوافل رمضان یا قیام رمضان کی جماعت سے مراد تراویح کی جماعت ہے، تہجد کی نہیں، چنانچہ انہی عبارتوں کی روشنی میں مفتی عزیز الرحمن صاحب نے یہی فتویٰ دیا ہے کہ رمضان میں بھی تہجد کی جماعت تداعی کے ساتھ مکروہ ہے، لیکن شیخ الاسلام حضرت مدنی رمضان المبارک میں تہجد باجماعت پڑھا کرتے تھے اور دلیل میں فتح الباری وغیرہ کی عبارت جہاں نفل فرماتے تھے وہاں رد المحتار

خلاصہ یہ ہے:

- ۱- غیر رمضان میں تہجد کے لئے جماعت کا اہتمام چاہے وہ شبِ برأت ہی کیوں نہ ہو، درست نہیں ہے۔
- ۲- رمضان المبارک میں تہجد کی نماز میں جماعت کا اہتمام کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر کچھ لوگ پسند نہ کریں اور وہ گھر پر یا مسجد میں اپنی نماز تہجد ادا کریں تو انہیں برا کہنا یا مطعون قرار دینا بہت بُری بات ہے۔
- ۳- جس مسجد میں شبِ برأت میں جماعت تہجد ہوتی ہے تو اسے بلاشبہ روک دینا چاہئے۔ رمضان میں گنجائش ہے، اس لئے اسے روکنا مناسب نہیں، البتہ جو شریک نہیں ہونا چاہے اور شریک نہ ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں۔
- ۴- میرے نزدیک رمضان ہو یا غیر رمضان، امام کو تہجد کی امامت کے لئے مجبور نہیں کیا جاسکتا، البتہ رمضان کی حد تک میری رائے میں امام تہجد کی امامت کریں تو کوئی حرج نہیں۔
- ۵- لوگوں کو صحیح احکام و مسائل بتانا چاہئے اور یہ سمجھانا چاہئے کہ محض اپنی ضد، خواہش نفس اور رواج کو سند نہ سمجھیں، اس لئے کہ فتنہ پیدا کرنا غلط بات ہے۔
- ۶- جو لوگ رمضان میں تہجد کی نماز باجماعت ادا نہیں کرتے انہیں برا نہیں کہا جاسکتا، اکثر علمائے احناف کی رائے یہی ہے، اس لئے ان کا عمل اپنی جگہ صحیح ہے اور جو لوگ جماعت کے ساتھ ادا کرتے ہیں انہیں بھی بُرا نہ کہا جائے کہ ان کا بھی عمل علماء کی رائے پر ہے۔
- ۷- واضح رہے کہ تہجد جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا مطلب جشن کرنا، رات جگا کرنا، دیگ چڑھانا نہیں ہے، قرآن پڑھا جا رہا ہے، لوگ چائے نوشی میں مشغول ہیں، رکوع کے وقت دوڑے جارہے ہیں، یہ بری باتیں ہیں، ان کو سختی سے منع کرنا چاہئے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کی یہ عبارت بھی نقل کرتے تھے: "السفل بالجماعة غیر مستحب لانه لم تفعله فی غیر رمضان" (رد المحتار ۱/۴۷۶) اور فرمایا کرتے تھے کہ تہجد بھی نوافل رمضان میں داخل ہے (فتاویٰ دارالعلوم ۳/۲۲۳)۔

باب صلاة المسافر

کیا وطن اصلی متعدد ہو سکتا ہے؟

برادر گرامی قدر جناب پی نذیر احمد صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ آپ نے دوران گفتگو مجھ سے ایک سوال کیا تھا، جس کا حاصل یہ تھا: آپ اور آپ جیسے بہت سے لوگ، جن کا اصل وطن ناتھ آرکٹ یا صوبہ تامل ناڈو کے مختلف قصبات میں ہے، لیکن وہ اپنی تجارت کے سلسلہ میں مدراس میں آکر قیام پذیر ہو چکے ہیں، یہاں تجارت، رہائش، اہل و عیال سب کچھ ہیں، مگر باوجود اس کے اپنے اصل وطن سے تعلق نہیں ٹوٹا ہے، وہاں بھی رہائشی مکانات ہیں، اراضی ہیں اور کچھ لوگوں کے کاروبار بھی ہیں۔ عام طور پر ہفتہ میں چند دن مدراس میں رہنے اور چند دن اپنے آبائی وطن میں گزارنے کی عادت ہے، اس طرح پابندی کے ساتھ دونوں جگہ رہنا سہنا ہے، اہل و عیال بھی کبھی یہاں اور کبھی وہاں رہتے ہیں، دونوں جگہ مستقل رہائش کا نظم ہے۔

لہذا ایسی صورت میں سوال یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو اپنے قصبات کو وطن سمجھ کر "مدراس" میں قصر کرنا چاہئے یا "مدراس" کو اپنا وطن سمجھنا چاہئے اور آبائی قصبات میں قصر کرنا چاہئے؟

الجواب وبالله التوفیق

آپ حضرات جو مذکورہ بالا صورت حال میں مبتلا ہیں، دراصل دونوں ہی مقامات پر مقیم ہیں، مدراس شہر ہو یا آپ کا آبائی قصبہ، دونوں ہی آپ کے لئے وطن اصلی کا درجہ رکھتے ہیں اور آپ لوگوں کو دونوں ہی مقامات پر نماز پوری پڑھنی چاہئے۔

اصل یہ ہے کہ "وطن اصلی" (یعنی آبائی وطن یا جہاں کسی شخص نے اہل و عیال بنائے ہوں یا وہ مقام جہاں کسی شخص نے مستقل توطن اختیار کر لیا ہو) وطن برقرار رہتا ہے اور کہیں بھی آنے جانے

سے اس کی وطنیت باطل نہیں ہوتی، تھوڑی ہی دیر کے لئے کسی، اگر وہاں آئے گا تو اسے پوری نماز پڑھنی ہوگی، وطن اصلی کی یہ نوعیت اس وقت تک قائم رہے گی، جب تک وہ اس وطن اصلی سے پوری طرح ترک تعلق کر کے دوسری جگہ اپنا وطن نہ بنالے۔

مشہور بات یہی ہے کہ وطن اصلی دوسرے وطن اصلی سے باطل ہو جاتا ہے، لیکن فقہاء نے اس میں ایک قید بھی لگائی ہے، وہ یہ کہ دوسری جگہ جا کر آباد ہو جانے کے بعد پہلے وطن سے اہل و عیال کو بھی نئے وطن میں منتقل کر لیا ہو، بلکہ ایک قول کے مطابق سامان و جائیداد بھی منتقل کر چکا ہو، گویا کلیۃً ترک تعلق کر لیا ہو تو پہلے وطن کی وطنیت باطل ہو جائے گی، چنانچہ صاحب درمختار نے لکھا ہے: "(الوطن الأصلي) هو موطن ولادته أو تاهله أو توطنه (یستل بمثله) إذا لم یبق له بالأول أهل، فلو بقی لم یستل بل یتیم فیہما" (۱)۔

یعنی وطن اصلی کی وطنیت اس وقت تک باقی رہے گی، جب تک دوسرے شہر کو وطن بنالینے کے بعد پہلے وطن میں اہل و عیال رکھنا بھی نہ چھوڑ دے، اگر ایسا نہ ہو، بلکہ دوسرے شہر میں اس نے توطن اختیار تو کر لیا ہے، لیکن پہلے وطن سے بھی تعلق باقی ہے کہ وہاں اس کے اہل و عیال رہتے ہیں، تو ایسی صورت میں دونوں ہی مقامات اس کے حق میں وطن اصلی شمار ہوں گے اور اسے دونوں ہی جگہ نماز پوری پڑھنی ہوگی۔

اور عالمگیری میں ہے: "وطن اصلی وطن اصلی سے باطل ہو جاتا ہے، جب کہ پہلے وطن سے اپنے اہل و عیال کے ساتھ منتقل ہو گیا ہو اور اس صورت میں جب کہ پہلے وطن سے اہل و عیال کو منتقل نہیں کیا، لیکن دوسرے شہر میں بھی اہل بنا لئے تو اس کا پہلا وطن باطل نہیں ہوگا اور دونوں ہی مقامات پر وہ نماز پوری پڑھے گا" (۲)۔

(۱) الدر المختار علی ہاشم رد المحتار ۲/۶۱۳ طبع بیروت۔

(۲) ویستل الوطن الأصلي بالوطن الأصلي إذا انتقل عن الأول بأهله وأما إذا لم تنتقل بأهله ولكنه استحدث أهلاً ببلدة أخرى فلا یستل وطنه الأول یتیم فیہما (الفتاویٰ الہندیہ ۱۲۲/۱)۔

اور قاضی خاں نے لکھا ہے: "وإن تأهل بهما كان كل من الموضع وطنًا أصليًا له" (۱)۔ یعنی اگر دونوں ہی جگہ اہل و عیال ہوں تو دونوں ہی جگہ اس کے لئے وطن اصلی ہوگی۔

اور علامہ کمال الدین ابن اہمام نے لکھا ہے: "(قوله فانتقل عنه واستوطن غيره) قید بالامرين، فإنه إذا لم ينتقل عنه بل استوطن آخر بأن اتخذ أهلاً له في الآخر فإنه یتیم فی الأول کما یتیم فی الثاني" (۲)۔

یعنی وطن اصلی کے باطل قرار پانے کے لئے دو ضروری شرطیں ہیں: ایک تو یہ کہ دوسری جگہ وطن بنالیا ہو اور دوسری شرط یہ ہے کہ پہلے وطن سے اہل و عیال کے ساتھ منتقل ہو کر بے تعلق ہو جائے، اگر ایسا نہ ہو، مثلاً دوسری جگہ وطن بنالیا، شادی کر لیا اور رہنے لگا، لیکن پہلی جگہ بھی اہل و عیال رہے تو وہ دونوں ہی مقامات پر پوری نماز پڑھے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وطن اول میں اہل و عیال تو نہیں رکھتا، لیکن وہاں اپنا رہائشی مکان اور زمین و جائیداد رکھتا ہے، تو ایسی صورت میں پہلا وطن، وطن باقی رہا؟ اس بارے میں فقہاء کی دو رائیں ہیں، ایک رائے تو یہ ہے کہ جب اہل و عیال نہیں رہتے تو وہ وطن باقی نہیں رہا، لیکن دوسرا قول یہ ہے کہ اس صورت میں بھی اس کی وطنیت باقی رہے گی اور اسے نماز پوری پڑھنی ہوگی اور یہی قول راجح معلوم ہوتا ہے جس کی طرف امام محمدؒ نے اپنی کتاب میں اشارہ فرمایا ہے۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے: "اگر کوئی شخص اپنے اہل و عیال اور سامان لے کر دوسرے شہر چلا گیا، لیکن اس کا گھر اور اس کی اراضی پہلے شہر میں باقی رہے۔ تو ایک قول یہ ہے کہ پہلا شہر اس کا وطن باقی رہا، اسی طرف امام محمدؒ نے "الکتاب" میں اشارہ کیا ہے" (۳)۔

(۱) فتاویٰ قاضی خاں علی الہندیہ ۱۶۶/۱۔

(۲) فتح القدیر ۲/۴۰۰، طبع دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

(۳) "لو انتقل بأهله ومتاعه إلى بلد وبقي له دور وعقار في الأول قبل بقي الأول وطنًا له وأهله أشار محمد رحمه الله تعالى في "الكتاب" (الفتاویٰ الہندیہ ۱۳۲/۱) نیز دیکھئے: البحر الرائق ۱۳۷/۲ طبع بیروت۔

علامہ ابن عابدین شامی نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے: ”ایسی صورت میں جب کہ وطن اول میں اس کے اہل و عیال نہیں رہتے تو محض رہائشی مکانات اور اراضی کی وجہ سے وطن اصلی باقی نہیں رہے گا، اس لئے کہ اعتبار اہل و عیال کا ہے، گھر کا نہیں، جیسے کوئی شخص کسی شہر میں شادی بیاہ کر کے مستقر رہنے لگے تو اگرچہ اس کا اپنا ذاتی مکان وہاں نہ ہو، وہ مقیم شمار ہوگا۔ ایک رائے تو یہ ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ ایسی صورت میں جب تک کہ اس کا رہائشی مکان اور اراضی موجود ہیں وہ اس کا وطن برقرار رہے گا (۱)۔“

علامہ شامی نے محیط وغیرہ کے حوالہ سے دونوں ہی رائیں ذکر کی ہیں اور لکھا ہے کہ دوسرے قول کی بنیاد پر دونوں ہی مقامات پر نماز پوری پڑھی جائے گی اگرچہ اس میں پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت نہ ہو: ”(بل یتیم فیہما) ای بمجرد الدخول وإن لم ینو إقامة“ (۲)۔

اور صاحب کفایہ نے مسئلہ پر مفصل بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: ”وفی المحيط“ ولو انتقل بأہلہ و متاعہ الی بلد و بقى له دور و عقار فی الأول، قبل بقى الأول و طناً له و الیہ اشار محمد فی کتاب حیث قال: ”باع دارہ و نقل عیالہ“ و قبل لم یبق، و فی الأجناس، قال هشام: سألت محمدا عن کوفی أوطن بغداد وله بالكوفة دار و اختاره الی مكة القصر؟ قال محمد: هذا حالی و أنا أرى القصر، إن نوى ترک وطنه إلا أن أبا یوسف کان یتیم بها، لكنه یحمل علی أنه لم ینو ترک وطنه (۳)۔

یعنی اگر کوئی اہل و عیال کے ساتھ دوسری جگہ منتقل ہو جائے، لیکن وطن اول میں رہائشی

(۱) ”فإن ماتت زوجة فی إحداهما و بقى له فیها دور و عقار قبل لا یبقی و طناً له، إذ المعتبر

الأهل دون الدار، كما لو تاهل ببلدة و استقرت سکناً له و لیس له فیها دار، و قبل بقى اه

قوله (إذا لم ینق له بالأول أهل) ای و إن بقى له فیہ عقار، قال فی النہر: و نقل أهلہ و متاعہ و له دور فی البلد لا یبقی و طناً له، و قبل بقى، کذا فی المحيط و غیرہ، قوله (بل یتیم

فیہما) ای بمجرد الدخول و إن لم ینو إقامة“ (رد المحتار ۲/ ۶۱۳ طبع بیروت)۔

(۲) رد المحتار ۲/ ۶۱۳ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت۔

(۳) الکفایہ مع فتح القدیر ۱۸/ ۲ طبع رشیدیہ پاکستان۔

مکان اور اراضی موجود ہوں تو ایک قول یہ ہے کہ وہ اس کا وطن باقی رہے گا، امام محمدؒ نے ”اہل و عیال کی منتقلی کے ساتھ رہائشی مکان کی فروختگی“ کا ذکر کر کے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ محض رہائشی مکان اور اراضی کی وجہ سے وطن اول، وطن باقی نہیں رہے گا، اس سلسلہ میں ”اجناس“ میں ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ ہشام نے امام محمدؒ سے مسئلہ پوچھا کہ ایک شخص جس کا وطن اصلی کوفہ میں تھا، اب وہ بغداد میں رہنے لگا، لیکن اس کا پہلا مکان کوفہ میں موجود ہے، اب وہ حج کے ارادہ سے سفر کرے، راستہ میں کوفہ سے گزرے تو قصر کرے یا نماز پوری پڑھے؟ امام محمدؒ نے فرمایا کہ یہی تو میرا حال ہے، اگر وہ شخص ترک وطن کی نیت کر چکا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اسے اس صورت میں قصر کرنا چاہئے، لیکن امام ابو یوسفؒ کوفہ میں نماز پوری پڑھتے تھے، لیکن ان کے اس عمل کو اس بات پر محمول کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کوفہ سے ترک وطن کی نیت نہیں کی ہوگی (۱)۔

آخر میں صاحب کفایہ نے نجم الدین الزاہدی کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے۔

شیخ نجم الدین زاہدی فرماتے ہیں: ”بہت سے مسلمان جو شہروں میں تو وطن اختیار کئے ہوئے ہیں، ان کے مکانات اور ان کی اراضی ان شہروں سے دور دیہاتوں میں واقع ہیں، جہاں جا کر وہ گرمی کا موسم اپنے اہل و عیال اور اپنے سامان کے ساتھ گزارتے ہیں، پس ان مکانات کی حفاظت بھی ضروری ہے، بیشک یہ دونوں ہی مقامات ایسے اشخاص کے لئے وطن ہیں اور ان میں سے ایک دوسرے کی وجہ سے باطل نہیں ہوگا“ (۲)۔

(۱) الکفایہ مع فتح القدیر ۱۸/ ۲ طبع رشیدیہ پاکستان۔

(۲) قال الشیخ نجم الدین الزاہدی: و هذا جواب واقعة ابتلینا بہ و کثیر من المسلمین

المتوطنین فی البلاد لہم دور و عقار فی القرى البعیدة منها فیصیفون بها بأہلہم و متاعہم فلا بد من حفظہا، أنہما و طناً له لا یبطل أحدهما بالآخر (الکفایہ مع فتح القدیر ۱۸/ ۲ طبع

رشیدیہ پاکستان)۔

واضح رہے کہ امام ابو یوسفؒ کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اگر سفر و اقامت میں شبہ پیدا ہو جائے تو اتمام ہی کرنا ہوگا کہ عبادات میں احتیاط ضروری ہے (۱)۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپ حضرات جن حالات میں مبتلا ہیں، اس کی صورت واضح ہے کہ دونوں ہی جگہ آپ کے اپنے رہائشی مکانات ہیں، جائیداد ہے، کبھی اہل و عیال کے ساتھ یہاں رہتے ہیں اور کبھی وہاں۔ ایسی صورت میں بلا اختلاف دونوں مقامات آپ کے لئے وطن اصلی شمار کئے جائیں گے اور دونوں ہی مقامات پر نماز پوری پڑھنا ضروری ہوگا۔

جو کچھ اس حقیر کی سمجھ میں آیا عرض کیا، آپ چاہیں تو اس تحریر کا حوالہ دے کر دوسرے علماء سے بھی تشفی کر سکتے ہیں، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب الجمعة

خطبہ کے دوران اردو میں تقریر

دونوں خطبوں کے درمیان عربی کے علاوہ اردو یا کسی دوسری زبان میں وعظ و نصیحت کرنا شرعاً کیسا ہے؟ اور اس طرح خطبہ دینے میں کوئی کراہت تو نہیں ہے؟

الجواب وبالله التوفيق

غیر عربی میں خطبہ جمعہ کے بارے میں علماء کی دو رائیں ہیں: بعض علماء اسے ناجائز و نادرست کہتے ہیں، بعض دیگر علماء اس کے جواز کے قائل ہیں، دونوں کے پاس دلائل ہیں اور دونوں رایوں کے پیچھے مختلف حکم و مصالح شرعی ہیں (۱)۔ اس مسئلہ کو بہر حال امت کے مابین اختلاف اور نفاق و شقاق کی بنیاد نہیں بنانا چاہئے۔ اگر حمد و نعت کے الفاظ عربی میں کہہ کر مختصر وعظ و تذکیر اردو میں کہنے کا رواج ہو (یعنی عربی وارد و مخلوط خطبہ) یا خالص عربی میں خطبہ کا رواج کسی مسجد میں ہو تو اسی طرح عمل ہونے دیا جائے۔ اس طرح کے معاملہ کو باعث فساد امت کے درمیان نہیں بنایا جائے، ہاں خطبہ میں شعر و شاعری اور غیر ضروری و طویل تقریر سے ضرور احتیاط کی جانی چاہئے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

خطبہ کی اذان کے بعد دعا

۱- خطبہ کی اذان کے بعد دعا مانگی جائے گی کہ نہیں؟

نماز جمعہ فوت ہو جائے تو ظہر کی نماز پڑھے گا؟

۲- جمعہ کی نماز فرض ختم ہونے کے بعد ظہر کی نیت سے نماز پڑھے گا یا جمعہ

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: الدر المختار مع رد المحتار ۲/۱۸۳، ۲۳۳، عمدۃ العارۃ حاشیہ شرح الوقایہ، باب الجمعة ۲۳۲/۱، فتاویٰ دارالعلوم ۵/۵۲، ۶۱، ۵۳، مجموع فتاویٰ ابن باز ۳/۳۹۳، ۳۹۵، طبع ریاض۔

کی نیت سے؟

الجواب وبالله التوفيق

- ۱- خطبہ کی اذان کا جواب زبان سے دینا یا اذان کے بعد دعا پڑھنا مناسب نہیں ہے، البتہ دل ہی دل میں پڑھ لے، کذا فی الشامی (۱)۔
- ۲- ظہر کی نیت سے چار رکعت نماز پڑھے (۲)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب الإمامة

کنوارے شخص کی امامت کا حکم

کنوارے امام کے پیچھے نماز فرض درست ہے یا نہیں؟ اس کی عبادت قبول ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق

امام شادی شدہ ہو یا کنوارا، اس کی امامت درست ہے اور جس طرح شادی شدہ کی عبادت قبول ہوتی ہے اسی طرح کنوارے کی بھی (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

نابالغ حافظ کی امامت کا حکم

ایک لڑکا تقریباً بارہ تیرہ برس کا ہے، وہ حافظ قرآن ہے، کیا اس کے پیچھے نماز درست ہے؟

الجواب وبالله التوفيق

حافظ صاحب اگر بالغ نہیں ہوئے ہیں (یہ بات ان سے دریافت کر لی جائے) تو ان کی امامت درست نہیں (۱)، بعض دفعہ عمر سے بلوغ ہوتا ہے، یعنی کسی کی عمر ۱۵ برس ہو اور کبھی احتلام

- (۱) امامت کی شرائط میں سے شادی شدہ ہونا نہیں ہے، بلکہ امامت کے لئے سب سے بہتر وہ شخص ہے جو نماز کے احکام کا عالم ہو، قرأت میں بہتر ہو، متقی، عمر دراز، اخلاق مند اور معزز ہو، جیسا کہ الدر المختار میں ہے: "والأحق بالإمامة..... (الأعلم بأحكام الصلاة)..... (ثم الأحسن تلاوة)..... (للقرآن ثم الأورع)..... الخ" (الدر المختار علی رد المحتار ۲/۲۹۳، ۲۹۵ طبع بیروت)، البتہ جہاں عمر دراز اور نو جوان کا اجتماع ہو اور دونوں علم و تقویٰ میں برابر ہوں تو وہاں عمر دراز شخص کو ہی امامت کے لئے پیش کرنا چاہئے، اس کی علت علامہ زبلی نے یہ لکھی ہے کہ ان کے اندر خشیت زیادہ ہوتی ہے اور ان کی امامت کو لوگ زیادہ پسند کرتے ہیں وغیرہ، تفصیل کے لئے دیکھئے: (رد المحتار ۲/۲۹۵ طبع بیروت)۔

- (۱) "وينبغي أن لا يجيب بلسانه اتفاقاً في الأذان بين يدي الخطيب" (الدر المختار علی ہامش رد المحتار باب الأذان ۲/۷۰ طبع بیروت)، اذان ثانی کے بعد دعا پڑھنا بھی اسی قبیل سے ہے، نیز حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر وغیرہ امام کے خطبہ کے لئے نکلنے کے بعد نماز پڑھنے اور کسی طرح کی گفتگو کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے (مصنف ابن أبي شيبة ۱/۳۵۷، ۳۵۸)۔
- (۲) "وكذا أهل مصر فاتتهم الجمعة فأنهم يصلون الظهر بغير أذان ولا إقامة ولا جماعة" (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۳/۳۳ طبع بیروت)۔

کے ذریعہ بھی بلوغ کا پتہ چلتا ہے، فقط (۲)، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

اجرت پر امامت کرنے کا حکم

ایک پیش امام کو بیس روپے ماہوار پر تین وقت کی نماز پڑھانے کے لئے مقرر کیا گیا، انہوں نے دو سال تک کام انجام دیا، بعدہ دوسرے سے دو وقت نماز پڑھوا کر ماہ بڑھایا، پھر لیتے رہے، اٹھارہ سال کے دوران پیش امام صاحب کا مشاہرہ تین سال کا باقی مبلغ ۷۲۰ روپیہ ہو گیا اور اٹھارہ سال تک پیش امام کا ایک وقت نماز نہ پڑھانے کی ڈیوٹی، باقی کے حساب سے پیش امام صاحب کی ڈیوٹی چھ سال باقی ہوئی ہے، اس حساب سے مبلغ ۱۳۴۰ روپیہ زائد لیا، اب دریافت امر یہ ہے کہ مسجد کی رقم ۱۳۴۰ روپیہ امام صاحب نے زائد لیا ہے اور پیش امام صاحب ۷۲۰ روپے مطالبہ کرتے ہیں، از روئے شریعت مطلع کریں۔

الجواب وبالله التوفیق

جب کہ آپ نے امام صاحب کو بیس روپے ماہوار پر مسجد کا ملازم رکھا اور تین وقت کی نماز پڑھانے کا معاہدہ کیا، اب امام صاحب نے خود یا اپنے نظم کے ذریعہ کسی دوسرے شخص کے ذریعہ سے نماز پڑھوا کر ۱۸ برسوں کی مدت پوری کر دی اور اس درمیان میں کسی ذمہ دار نے عدم رضامندی کا اظہار یا معاہدہ ختم کرنے کا اقدام نہیں کیا تو ایسی صورت میں اب امام صاحب کی تنخواہ بہر حال واجب الادا ہے، اس واجب کو ساقط کرنے کے لئے حیلے نہیں نکالنے چاہئیں (۳)، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱) "ولا يصح اقتداء رجل بامرأة" (وصی مطلقاً) ولو في جنازة ونقل على الأصح (الدر المختار)، لأن الإمامة للبالغين من شروط صحتها البلوغ" (رد المحتار ۲/۳۲۱، ۳۲۲ طبع بیروت)۔

(۲) "بلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال والإنزال" والأصل هو الإنزال فلما يعلم منها (فإن لم يوجد فيهما) شيء (فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة، به يفتي) (الدر المختار علی رد المحتار ۲/۳۲۵، ۳۲۶ طبع بیروت)۔

(۳) دیکھئے: الفتاویٰ الہندیہ ۳/۳۲۵، ۳۲۶۔

باب تسوية الصفوف

درمیان نماز میں شامل ہونے والا کس طرف کھڑا ہو؟

۱- نماز میں جماعت کے درمیان آنے والا شخص کس طرف کھڑا ہو، دائیں یا بائیں؟

درمیان نماز میں آنے والا جس حال میں امام کو یا شریک ہو جائے

۲- کوئی فرض نماز ہو رہی ہو تو پیچھے آنے والا شخص پہلے چھوٹی ہوئی رکعتوں کو پڑھے گا یا جماعت کے ساتھ شریک ہو جائے گا؟

الجواب وبالله التوفیق

۱- جماعت کی نماز شروع ہو جانے کے بعد ملنے والا شخص صف کے دائیں اور بائیں دیکھ کر جس طرف لوگ کم ہوں اس طرف جا کر مل جائے (۱)۔

۲- اگر درمیان نماز میں کوئی آئے تو امام کو جس حال میں پائے اس کے ساتھ شریک ہو جائے، جب امام سلام پھیر دے تو جتنی رکعت نماز چھوٹ گئی ہے اسے ادا کرے (۲)، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱) حدیث میں ہے: "وسطوا الإمام وسدوا الخلل" (سنن أبی داؤد ۱/۳۳۹) اور رد المحتار میں ہے: "ومتى استوى جانباهما يقوم عن يمين الإمام إن أمكنه" (رد المحتار باب الإمامة ۲/۳۱۰، ۳۱۱ طبع بیروت)۔

(۲) علماء السنن ۳/۳۲۲۔

باب الجنائز

پیٹ میں مرے ہوئے بچہ کا جنازہ اور تدفین

گزارش عرض ہے کہ ایک حاملہ عورت کے پیٹ سے ڈاکٹر نے مرا ہوا بچہ نکالا، بعدہ قریب ۳ گھنٹہ کے بعد عورت بھی انتقال کر گئی، اس نعش کو اسپتال سے لا کر دفن کا انتظام کیا گیا، لیکن امام صاحب ایک ہی ساتھ نماز جنازہ پڑھا کر ایک ہی قبر میں دفن کرائے، جب اس پر چند آدمیوں نے اعتراض کیا تو انہوں نے کہا کہ ایسا ہو سکتا ہے، اس پر حکم شرعی کیا ہوگا؟

الجواب وبالله التوفیق

جب بچہ مرا ہوا نکالا گیا تو اس پر نماز جنازہ ہے ہی نہیں، اسی لئے غالباً آپ کے امام صاحب نے صرف عورت کی نماز جنازہ پڑھی، البتہ اس بچے کو علاحدہ دفن کرنا چاہئے تھا، اس لئے کہ بلا ضرورت مردوں کو ایک قبر میں دفن نہیں کرنا چاہئے (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱) عن جابر رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: "الطفل لا یصلی علیہ ولا یحس ولا یورث حتی یتھل" (سنن ترمذی، باب ترک الصلاة علی الجنین حتی یتھل ۳۵۰/۳ طبع استنبول)، ایسے بچے کا حکم یہی ہے کہ اس کو غسل دیا جائے، اس کا نام رکھا جائے اور اس کو کفنایا جائے، البتہ اس پر نماز جنازہ نہ پڑھی جائے، جیسا کہ الدر المختار میں ہے: "وإن غسّل وسمی" (وادرج فی خرقہ ودفن ولم یصل علیہ) (الدر المختار علی رد المحتار ۳/۱۳ طبع بیروت)۔

کتاب الزکاة

پراویڈنٹ فنڈ میں جمع شدہ رقم کی زکاة

وہ سرکاری ملازمین جن کی تنخواہوں میں سے کچھ رقم وضع کر کے پراویڈنٹ فنڈ میں جمع کر لیا جاتا ہے اور یہ رقم یا تو اس کے ریٹائرڈ ہونے کے وقت اکٹھا گورنمنٹ کی طرف سے ادا کر دی جاتی ہے، یا مرنے کے بعد اس کے وارثان کو دے دی جاتی ہے، اس دوران ملازمت میں اس سرکاری ملازم کو یہ حق ضرور ہوتا ہے کہ وہ اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے بطور دستگرواں بہ وقت ضرورت کچھ رقم لے سکتا ہے، مگر قسط وار اس کی وصولی بھی کر لی جاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے:

(الف) اس فنڈ میں جمع شدہ رقم پر سال گزرنے کے بعد زکاة واجب ہوگی یا نہیں؟

(ب) اگر بالفرض فی الحال زکاة واجب نہیں ہوتی تو کیا اس کے ریٹائرڈ ہونے کے وقت جب یہ کل رقم ملے گی تو اس وقت جس سال اسے ملے گی صرف اسی سال کی زکاة واجب ہوگی یا اس پوری ملازمت کی مدت کا سالانہ حساب کیا جائے گا؟

الجواب وبالله التوفیق

پراویڈنٹ فنڈ دین ضعیف کے حکم میں ہے، یعنی دین واجب فی الذمہ ہے، لیکن غیر مال کا بدل ہے، جیسے دین مہر یا دیت (۱)۔ پس اس پر زکاة اسی وقت واجب ہوگی جب وہ رقم وصول

(۱) دین ضعیف وہ دین ہے جو کسی فروخت شدہ چیز کا ثمن یا نقدی قرض کا بدل نہ ہو، یعنی غیر مال کا بدل ہو جیسے مہر، دیت، بدل کتابت اور بدل خلع وغیرہ، اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر آدمی دین ضعیف کے کچھ حصہ پر قبضہ کر لے اس

ہو جائے اور اس پر سال گزر جائے (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

قرض میں لگی ہوئی رقم کی زکاة

زید کے پاس نقد دو سو روپے ہیں اور دو سو اس نے بکر کو قرض دے رکھا ہے، اب سال گزر جانے کے بعد زید صرف دو سو روپیوں کی زکاة ادا کرے گا یا ان دو سو روپیوں کی بھی زکاة ادا کرے گا جو اس نے بکر کو قرض دے رکھا ہے؟

الجواب وبالله التوفیق

یہ دو سو روپے جو زید نے بکر کو قرض دیئے ہیں یہ دین قوی ہے۔ اگر زید کے پاس والی نقد رقم اور بکر کو دی ہوئی قرض والی رقم ملا کر نصاب کو پہنچ جاتی ہے تو زکاة واجب ہوگئی، لیکن زکاة کی ادائیگی قرض کی واپسی پر کرنی ہوگی (۲)، اگر پہلے ادا کرے تو بھی جائز بلکہ بہتر ہوگا، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

حال میں کہ اس کے پاس پہلے سے بقدر نصاب مال موجود ہو اور حوالان حول بھی ہو جائے تو مال مستفاد کی طرح اس کی بھی اصل مال کے ساتھ ملا کر زکاة ادا کی جائے گی، اور اگر پہلے سے وہ مالک نصاب نہیں ہے تو اس وقت تک اس مال پر زکاة واجب نہیں ہوگی جب تک بقدر نصاب مال پر قبضہ نہ کر لے اور اس پر سال نہ گزر جائے، "الدين الضعيف: وهو مال من يضمن مبيع ولا بدلاً لقرض نقد ومثاله المهر والدية وبدل الكتابة والخلع" (الموسوعة الفقهية ۲۳/۲۳۰ بحوالہ الدر المختار وحاشية ابن عابدین ۲/۳۶۵)۔

(۱) "وعند قبض (ماتنين مع حولان الحول بعده) أي بعد القبض (من) دين ضعيف" (الدر المختار مع رد المحتار ۲۳۹/۳ طبع دار الكتب العلمية بيروت)۔

(۲) "اعلم أن الديون عند الإمام ثلاثة: قوي ومتوسط، وضعيف (تجب) زكاتها إذا تم نصاباً وحال الحول، لكن لا فوراً بل" (عند قبض أربعين درهماً من الدين) القوي كقرض" (الدر المختار مع رد المحتار باب زكاة المال ۲۳۶/۳)۔

پگڑی اور پیشگی کے طور پر دی ہوئی رقم کی زکاة

بخدمت جناب مولانا مجاہد الاسلام صاحب! زید مجدکم
مجلد بحث و نظر (جنوری تا مارچ کی اشاعت) میں پگڑی کے تعلق سے بحث و مباحثہ شائع ہوا ہے، اسی قبیل سے لیکن مختلف النوع ایک مسئلہ فی زمانہ درپیش ہے، یعنی مکان، دوکان خصوصاً کارخانے کرائے پر اٹھاتے وقت کرائے دار سے مالک مکان، دوکان ایک معتد بہ رقم بطور زر پیشگی (Advance) حاصل کر لیتے ہیں، یہ رقم لاکھ دو لاکھ تک بھی پہنچ جاتی ہے اور کرائے کی جگہ خالی کرنے تک مالک مکان کے پاس رہتی ہے اور جگہ خالی کرنے کے موقع پر واپس ملتی ہے، یہ مدت سال دو سال کی بھی ہو سکتی ہے، یا دس بیس سال بھی۔ اس عرصے تک مالک مکان اس رقم سے نفع حاصل کرتا رہتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس رقم پر زکاة کون ادا کرے؟ آپ کا ذہن رسالت کی تہہ تک پہنچ گیا ہوگا، چنانچہ مسئلہ کی مزید وضاحت سے گریز کرتا ہوں، اور اس مسئلہ میں آپ کی رہنمائی کا طالب ہوں۔

الجواب وبالله التوفیق

محترمی! سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا، یا دفرمائی کے لئے ممنون ہوں۔

آپ نے دو سوالات کئے ہیں، آپ کا پہلا سوال کرایہ داری کے ضمن میں زر پیشگی (Advance) کی زکاة سے متعلق ہے، میں نے اس مسئلہ پر غور کیا، جو روپے کرایہ دار مالک مکان کو دیتا ہے، وہ رقم اس کے قبضے اور تصرف سے نکل جاتی ہے، اس طرح کہ جب تک وہ مکان روکان نہ چھوڑے، وہ رقم واپس نہیں لے سکتا، اس رقم کو "مال ضماری" (۱) یا ڈوبا ہوا تو نہیں کہا جاسکتا، لیکن اس

(۱) مال ضماری اس غائب شدہ مال کو کہتے ہیں جس کی واپسی کی امید نہ ہو، "أما الضماری من المال: فهو الغائب الذي لا يرجع عوده، فإذا رجع فليس بضماری" (الموسوعة الفقهية ۲۸/۲۱۳ بحوالہ المصباح المنیر)

کے قبضہ میں نہیں ہے اور نہ وہ اس پر کوئی تصرف کر سکتا ہے، امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وجوب زکاة کے لئے "ملک تام" (مکمل ملکیت) ضروری ہے، یعنی وہ شخص اس چیز کا مالک بھی ہو اور وہ اس کے قبضہ میں بھی ہو، اگر ملک ہو، قبضہ نہ ہو یا قبضہ ہو مگر ملک نہ ہو تو اس مال پر زکاة واجب نہیں ہوگی (۱)، البتہ قبضہ حقیقی بھی ہو سکتا ہے، اور حکمی بھی، جیسے کسی کو قرض دیا ہو اور وہ قبضہ حقیقی قبضہ میں نہیں ہے، لیکن مانا جائے گا کہ وہ جب چاہے واپس لے سکتا ہے، اور اس پر تصرف کر سکتا ہے، بشرطیکہ مقروض قرضے کا اقرار کرتا ہو، یا اگر انکار کرتا ہو تو قرضہ دینے والے کے پاس اس کا ثبوت موجود ہو، لیکن رہن کی صورت میں جو مال رہن رکھا گیا ہے اگرچہ وہ مالک کی ملکیت میں ہے، لیکن اس کے قبضہ میں نہیں ہے، اس لئے "مال رہن" پر زکاة نہیں ہے، مالک پر اس لئے نہیں کہ اس کا قبضہ نہیں اور جس کے پاس رہن رکھا گیا ہے اس پر اس لئے نہیں کہ وہ قابض تو ہے مگر مالک نہیں (۲)۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ وہ مال جو ضروریات زندگی یا وسائل رزق میں مشغول ہو، اس پر زکاة واجب نہیں جیسے رہائشی مکان یا صنعت کار کے آلات اور اس کی مشینیں (۳)۔

میرے نزدیک صورت زیر بحث میں بطور پیشگی (Advance) جو رقم مالک مکان و دوکان

۲۰۳۰، لسان العرب، مشارق لا نور ۵۸/۲، المغرب ۱۲/۲۔

اس کی اصطلاحی تعریف کرتے ہوئے علامہ کاسانی نے لکھا ہے کہ مال شمار ہر وہ مال ہے جس سے انتفاع پر قدرت نہ ہو باوجودیکہ اصل ملک قائم ہو، "هو كل مال غير مقدور الانتفاع به مع قيام اصل الملك" (بدائع الصنائع ۹/۲ طبع دار الفکر بیروت)، نیز دیکھئے: البحر الرائق ۲/۲۲۲، رد المحتار ۹/۲۔

(۱) "وسبب ائى سبب الفراضها (ملک) (تام) لان السراد بالتام: المملوك رقة ويدا" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۱۵۵، ۱۵۳ طبع بیروت)، نیز دیکھئے: فتح القدير ۲/۱۶۳ طبع بیروت۔

(۲) "ولا في مرهون) اي لا على المرتهن لعدم ملك الرقة، ولا على الراهن لعدم اليد" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۱۸۰ طبع بیروت)۔

(۳) "ولا في ثياب البدن واثاث المنزل ودور السكنى ونحوها) وكذلك آلات المحترفين يساوي نصبا وان حال الحال" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۱۸۲، ۱۸۳)۔

کو دی جاتی ہے، اس کی حیثیت رہن کی سی ہے اور اس پر مالک کو "ملک تام" حاصل نہیں اور جس طرح رہن میں جب تک "دین" ادا نہیں کرتا مال رہن کو واپس نہیں لے سکتا، اسی طرح یہاں جب تک مکان، دوکان، کارخانہ خالی نہ کر دے، پیشگی میں دی ہوئی رقم کو واپس نہیں لے سکتا، لہذا اس پر زکاة واجب نہیں ہونی چاہئے، مزید برآں یہ کہ رہائشی مکان ہو یا تجارتی دوکان ہو، یا صنعتی کارخانہ ہو، اگر کرایہ پر لیا گیا تو وہ رقم جو بطور ایڈوانس (Advance) دی گئی ہے وہ ضروریات اصلہ یا وسائل رزق میں مشغول ہے، رہائشی مکان تو ظاہر ہے کہ انسان کی بنیادی ضرورت ہے، دوکان اور کارخانے کے سلسلہ میں جو رقم ایڈوانس (Advance) دی گئی ہے، اس کی وجہ سے وہ دوکان چلا رہا ہے، یا کارخانہ چلا رہا ہے اور دوکان و کارخانہ کی آمدنی کی سالانہ بچت اگر نصاب کو پہنچ جائے اسے زکاة دینی ہے اور جس طرح دوکان کے فرنیچر، وزن کے آلات، نیز کارخانے کی مشینوں پر اس لئے زکاة نہیں ہوتی کہ وہ ذرائع و وسائل ہیں، ان کی حیثیت تجارتی مال کی نہیں، اسی طرح وہ رقم جو دوکان اور کارخانے کو کرایہ پر لینے میں مشغول ہے اسے ان مشینوں کی طرح تصور کیا جانا چاہئے اور ان پر زکاة واجب نہیں ہونی چاہئے۔

اس لئے میری رائے میں مکان، دوکان اور کارخانے کی کرایہ داری پر دیا ہوا (ایڈوانس) ایسا مال ہے جو مالک کے قبضہ و تصرف میں نہیں ہے، مال رہن کی طرح ہے، نیز ضروریات و وسائل رزق میں مشغول ہے، اس لئے ان پر بھی زکاة واجب نہیں ہوگی، جب وہ رقم واپس آجائے گی تو سال گزرنے پر زکاة دینی ہوگی، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب المصارف

کیا فی زمانہ سادات کو زکاۃ دی جاسکتی ہے؟

کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ موجودہ حالات میں جب کہ بیت المال وغیرہ کا نظام نہیں ہے، سادات کو زکاۃ دی جاسکتی ہے؟

الجواب وبالله التوفیق

موجودہ دور میں کسی ہاشمی کو جو فقیر ہو زکاۃ دینا میرے نزدیک جائز ہے۔

اس بارے میں اصل مسلک تمام ہی علماء کا یہی ہے کہ زکاۃ ہاشمی کو نہیں دی جاسکتی، لیکن اس ظاہر الروایہ اور مشہور مسلک سے الگ ہو کر ایک قول امام ابو یوسفؒ کا یہ منقول ہے کہ ہاشمی کی زکاۃ ہاشمی کو دی جاسکتی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ سے ابو عصمہ کی روایت یہ ہے کہ امام صاحب سادات کے لئے علی الاطلاق جواز زکاۃ کے قائل ہیں۔ خواہ زکاۃ ہاشمی کے مال کی ہو یا غیر ہاشمی کے مال کی۔ امام صاحب کا نقطہ نظر یہ ہے کہ خمس خمس جو اہل قرابت رسول کے لئے تھا، اب وہ انہیں نہیں ملتا، زکاۃ ان پر حرام قرار دی گئی تھی، لیکن اس کا بدل خمس خمس مقرر کر دیا گیا تھا، اب جب کہ وہ بدل ختم ہو گیا تو اصل یعنی زکاۃ ان کے لئے حلال ہوگی، امام طحاویؒ نے اسی قول کو اختیار ہے، شوافع میں اصطرخی اور بعض حنابلہ کی بھی یہی رائے ہے۔

متاخرین علماء ہند میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے بارے میں فیض الباری میں نقل کیا ہے کہ سادات کا مجبور ہو کر بھیک بھانگنے کے مقابلہ میں زکاۃ کھانا آسان تر ہے، لہذا میں بھی یہی فتویٰ دیتا ہوں۔ کفایت المفتی میں مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی کا فتویٰ جواز ہی کا نقل کیا گیا ہے گرچہ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کو اس سے اتفاق نہیں۔

بہر حال قول امام مختلف ہے، امام طحاویؒ اور بعض دیگر علماء نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، اختلاف دلیل و براہین کا نہیں، بلکہ بدلتے ہوئے حالات اور زمانہ کا ہے، اس لئے اپنے دور کے حالات کے اعتبار سے اس روایت غیر مشہورہ پر فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔

موجودہ حالات یہی ہیں کہ خمس خمس سادات کو ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، عطایا و ہدایا کے ذریعہ سادات کی خدمت کا جذبہ مفقود ہوتا جا رہا ہے، لہذا میں پوری ہمتانیت قلب کے ساتھ یہ رائے رکھتا ہوں اور فتویٰ دیتا ہوں کہ ضرورت مند سادات کو زکاۃ شرعیہ دی جاسکتی ہے۔

تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایا جائے، ہدایہ میں لکھا ہے: "ولا تدفع إلی بنی ہاشم، لقولہ علیہ السلام یا بنی ہاشم إن اللہ تعالیٰ حرّم علیکم غسالۃ الناس وأوساخہم وعوضکم منها بخمس الخمس اھ" (۱)۔

اس کے تحت فتح القدیر میں لکھا ہے: "هذا ظاهر الروایۃ وروی أبو عصمۃ عن أبي حنیفۃ أنه یجوز فی هذا الزمان وإن كان ممتنعاً فی ذلک الزمان وعنه وعن أبي یوسف أنه یجوز أن یدفع بعض بنی ہاشم إلی بعض زکاتہم" (۲)۔

اور تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق میں لکھا ہے: "لا إلی ذمی... او ہاشمی" (۳)۔

وروی أبو عصمۃ عن أبي حنیفۃ جواز دفع الزکاۃ إلی الہاشمی فی زمانہ وروی عن أبي حنیفۃ أن الہاشمی یجوز له أن یدفع زکاتہ إلی الہاشمی" (۴)۔

اسی کے ذیل میں علامہ شمس حاشیہ تبیین میں فرماتے ہیں: "قولہ روى أبو عصمۃ عن أبي حنیفۃ جواز دفع الزکاۃ قال الطحاوی هذه الروایۃ عن أبي حنیفۃ لیست بالمشہورۃ اھ غایۃ وفی شرح الآثار عن أبي حنیفۃ لا بأس بالصدقات کلہا علی بنی ہاشم والحرمة للعوض وهو خمس الخمس فلما سقط ذلک بموتہ علیہ السلام حلت لهم الصدقة، قال الطحاوی وبہ نأخذ وفی التفتیح یجوز الصرف إلی بنی ہاشم فی قولہ خلافا لہما" (۵)۔

(۱) الہدایہ ۲/۲۶۶ طبع کراچی۔

(۲) فتح القدیر ۲/۲۷۷ طبع بیروت۔

(۳) تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ۱/۳۰۳ طبع مکتبہ امدادیہ ملتان۔

(۴) حاشیہ شمس علی تبیین الحقائق ۱/۳۰۳ طبع مکتبہ امدادیہ ملتان۔

اور در مختار میں ہے: "ولا إلى بني هاشم (قوله إطلاق المنع) يعني سواء في ذلك كل الأزمان وسواء في ذلك دفع بعضهم لبعض ودفع غيرهم لهم وروى أبو عصمة عن الإمام أنه يجوز الدفع إلى بني هاشم في زمانه لأن عوضها وهو خمس الخمس لم يصل إليهم لإهمال الناس أمر الغنائم وإيصالها إلى مستحقها وإذا لم يصل إليهم العوض عادوا إلى المعوض كذا في البحر۔

وقال في النهر: وجوز أبو يوسف دفع بعضهم إلى بعض وهو رواية عن الإمام (۱)۔

کفایہ میں لکھا ہے: "ولا تدفع إلى بني هاشم... الحرمة كانت في عهد النبي ﷺ للعوض وهو خمس الخمس فلما سقط ذلك بموته حلت لهم الصدقة... قال الطحاوي: وبالجواز نأخذ" (۲)۔

اور فیض الباری شرح بخاری میں ہے: "ونقل الطحاوي عن أمالي أبي يوسف أنه جاز دفع الزكاة إلى آل النبي ﷺ عند فقدان الخمس فإن في الخمس حقهم فإذا لم يوجد صح صرفها إليهم — وفي البحر عن محمد بن شجاع الثلجي عن أبي حنيفة أيضا جوازه — وفي عقد الجيد أن الرازي أيضا أفتى بجوازه۔ قلت: وأخذ الزكاة عندي أسهل من السؤال فأفتى به أيضا" (۳)۔

اور حاشیہ میں مولانا بدر عالم صاحب تحریر فرماتے ہیں: "نقل العيني عن الاصطخري أيضا أنهم إن منعوا الخمس جاز صرف الزكاة إليهم وروى ابن سماعة عن أبي يوسف أن الزكاة من بني هاشم تحل لبني هاشم، ولا تحل لهم من غيرهم وفي "الينابيع" يجوز للهاشمي أن يدفع زكاته للهاشمي عند أبي حنيفة ولا يجوز عند أبي يوسف وفي

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ۲/۳۹۸، ۲۹۹ طبع بیروت۔

(۲) الكفایہ مع فتح القدر ۲/۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳ طبع رشیدیہ پاکستان۔

(۳) فیض الباری ۵۲/۳ طبع مکتبہ حقانیہ پاکستان۔

"جوامع الفقہ" یکرہ للهاشمی عند أبي يوسف خلافاً لمحمد (۱)۔

اور شرح معانی الآثار میں لکھتے ہیں: "وقد اختلف عن أبي حنيفة في ذلك، فروي عنه أنه قال لا بأس بالصدقات كلها على بني هاشم، وذهب في ذلك عندنا إلى أن الصدقات إنما كانت حرمت عليهم من أجل ما جعل لهم في الخمس من سهم ذوي القربى فلما انقطع ذلك عنهم ورجع إلى غيرهم بموت رسول الله ﷺ حل لهم بذلك ما قد كان محرماً عليهم من أجل ما قد كان أحل لهم وقد حدثني سليمان بن شعيب عن أبيه عن محمد عن أبي يوسف عن أبي حنيفة في ذلك مثل قول أبي يوسف في هذا نأخذ" (۲)۔

اور فتاویٰ کبریٰ کے اخیر میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتاب "الاختيارات النخبية" میں لکھا ہے: "وبنو هاشم إذا منعوا من خمس الخمس جاز لهم الأخذ من الزكاة وهو قول القاضي يعقوب وغيره من أصحابنا وقاله أبو يوسف والاصطخري من الشافعية لأنه محل حاجة وضرورة" (۳)۔

فدیہ نماز اور اس کا مصرف؟

مکرمی و محترمی جناب مفتی صاحب دامت برکاتہم
سلام مسنون

عرض خدمت یہ ہے کہ درج ذیل مسئلہ میں قرآن و حدیث کی روشنی میں ہدایت و رہنمائی مطلوب ہے، براہ کرام فقہ حنفی کی روشنی میں وضاحت فرمادیں، جزاک اللہ۔

(۱) فیض الباری ۵۲/۳ طبع مکتبہ حقانیہ پاکستان۔

(۲) شرح معانی الآثار ۲/۳۳۳ طبع المکتبۃ الاشرفیہ دیوبند۔

(۳) مجھے "فتاویٰ کبریٰ" کا وہ نسخہ نہیں مل سکا جس کے اخیر میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتاب "الاختيارات النخبية" چھپی ہوئی ہے، البتہ اب یہ کتاب علیحدہ دار الفکر بیروت سے چھپ گئی ہے، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی لائبریری میں نسخہ ہے جس کے ص ۱۰۳ پر یہ عبارت موجود ہے۔

۱- فدیہ نماز (یعنی جو نمازیں ترک ہو چکی ہیں ان کے بدلہ میں فدیہ زکاۃ لانا مقصود ہے) کی مقدار کیا ہے؟

۲- فدیہ نماز کا مصرف کیا ہے؟

۳- خاص طور سے مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے والے غریب بچوں پر اس کا استعمال ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق

۱- نماز ہر عاقل، بالغ، مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے، جو نمازیں چھوٹ گئی ہیں ان کی قضا ضروری ہے، زندگی میں فدیہ ادا کرنے سے نماز کا وجوب ختم نہیں ہوگا، اس لئے جتنی نمازیں بلوغ کے بعد سے قضا ہوئی ہیں، ان سب کی قضا کی جائے۔ حدیث شریف میں ہے: "من نسى صلاة او ناسم عنها فكفارته ان يصلیها اذا ذكرها" (۱)، ہاں اگر کوئی شخص مرنے سے پہلے وصیت کر گیا ہو کہ میری چھوٹی ہوئی نمازوں کا کفارہ ادا کر دیا جائے تو اس کے ترکہ کے ایک تہائی مال میں سے چھوٹی ہوئی نمازوں کا فدیہ ادا کیا جائے گا، ہر ایک نماز کے بدلہ نصف صاع گیہوں یا اس کی قیمت فقراء کو دی جائے گی، اسی طرح ہر وتر کے بدلہ بھی نصف صاع گیہوں یا اس کی قیمت غریبوں کو دی جائے گی۔ درمختار میں ہے: "لومات وعليه صلوات فائتة وأوصى بالكفارة يعطى لكل صلاة نصف صاع من بر كالفطرة وكذا حكم الوتر والصوم وإنما يعطى من ثلث ماله" (۲)۔

نصف صاع گیہوں موجودہ وزن میں لگ بھگ ایک کلو سات سو گرام کے برابر ہے۔

۲- مذکورہ بالا فدیہ کا مصرف وہی ہے جو زکاۃ و فطرہ کا مصرف ہے (۳)۔

(۱) صحیح ۱/ ۷۷ حدیث: ۳۱۵ طبع استنبول۔

(۲) الدر المختار علی رد المحتار، باب قضاء الفوائت ۵۳۲/۲ طبع بیروت۔

(۳) زکاۃ و صدقات کے مصارف قرآن و حدیث میں مصرح ہیں، قرآن کریم میں ہے: "إنما الصدقات للفقراء والمساكين الخ" (سورہ توبہ ۶۰) (صدقات واجبہ) تو صرف غریبوں کا اور محتاجوں اور کارکنوں کا حق جو

۳- مدرسہ کے غریب بچوں کو دیا جاسکتا ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

اسکول و کالج کے طلبہ کو زکاۃ کی رقم دینا

محترم قاضی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، میرا نام رضوان اللہ خاں ہے، میں صوبہ بہار کے شہر گیا کارہنے والا ہوں، گزشتہ دس سالوں سے ظہران یونیورسٹی میں ملازم ہوں، عرض یہ ہے کہ میرے چند ساتھیوں نے بہ شمول میرے غریب طالب علموں کی مالی مدد کے لئے ایک ٹرسٹ قائم کیا ہے، جو علی گڑھ میں رجسٹرڈ ہے اس ٹرسٹ کا نام "سر سید اسکالر شپ ٹرسٹ" ہے، اس ٹرسٹ کے تحت علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھنے والے غریب طلباء کی مدد کی جاتی ہے، ہم لوگ پچھلے کئی سالوں سے اس ٹرسٹ کے لئے یہاں پر پیسے جمع کر رہے ہیں۔ کچھ حضرات اپنے زکاۃ کے پیسے بھی دینا چاہتے ہیں، مگر ہم لوگوں نے فی الحال زکاۃ کی رقم لینے کا سلسلہ شروع نہیں کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے آپ لوگوں کی رہنمائی چاہئے۔

میرا سوال یہ ہے کہ "کیا زکاۃ کی رقم غریب مسلم طلباء کے پڑھنے کے لئے مالی مدد کے طور پر خرچ کی جاسکتی ہے یا نہیں؟"

آپ کا جواب صاف صاف الفاظ میں ہم لوگوں کو درکار ہے، تاکہ اسی بنیاد پر دوسروں سے بھی رابطہ قائم کیا جاسکے، فقط والسلام۔

الجواب وبالله التوفیق

زکاۃ کی رقم محتاج اور غریب لوگوں کو دی جاسکتی ہے، سر سید اسکالر شپ کے تحت غریب و محتاج طلبہ کو مدد زکاۃ سے وظیفہ دیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ وہ واقعی محتاج ہوں، عام طور پر اس میں دھوکہ

ان پر مقرر ہیں اور نیز ان کا جن کی دلجوئی منظور ہے، اور (صدقات کو صرف کیا جائے) گروہوں (کے چھڑانے) میں اور قرضداروں (کے قرض ادا کرنے) میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں (کی امداد) میں۔

ہوتا ہے، اس لئے پوری تحقیق کر لی جائے، ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنی ذاتی حیثیت میں عنی ہے، لیکن علی گڑھ یونیورسٹی یا دیگر بڑے شہروں یا لندن اور امریکہ میں وہاں کے مصارف برداشت نہیں کر سکتا ہو اور اس لئے وہ وظیفہ کا خواہاں ہو، لیکن وہ شریعت کی اصطلاح میں محتاج نہیں، اس لئے اسے زکاۃ نہیں دی جاسکتی۔ فقیر و محتاج سے مراد ایسے لوگ ہیں جن کے پاس بہ قدر نصاب مال نامی نہ ہو یا بہ قدر نصاب مال ہو، لیکن اس کی ضروریات اصلیہ میں مشغول ہو۔

اگر بہ قدر نصاب مال نامی (ایسا مال جس میں اضافہ کے امکانات ہوں، جیسے سونا، چاندی اور مال تجارت) دین سے فارغ ہو تو اس پر زکاۃ واجب ہوتی ہے اور اگر ایسا مال نہ ہو تو زکاۃ واجب نہیں ہوگی اور اگر مال تو اس کے پاس ہے، لیکن اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لائق ہے، زائد نہیں تو ایسے شخص کے لئے زکاۃ قبول کرنا حلال ہوگا۔

”والحاصل أن النصاب قسمان موجب الزكاة وهو النامي الخالي عن الدين وغير موجب لها وهو غيره فإن كان مستغرقاً بالحاجة لمالكه أباح أخذها وإلا حرّمه الخ (۱)، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔“

ریلیف کی بجی ہوئی رقم کا مصرف

محترم و مکرم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

درج ذیل مسئلہ میں قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت مطلوب ہے، براہ کرم مدلل و مفصل جواب مرحمت فرمائیں۔

ارضی حادثات، سماوی آفات اور فرقہ وارانہ فسادات کے مواقع پر انسانی ہمدردی رکھنے والی مختلف تنظیموں اور جماعتوں کی جانب سے متاثرین کو راحت اور ریلیف پہنچانے کی خدمات انجام دی جاتی ہیں۔ عوام سے امداد کی اپیل کی جاتی ہے اور خیر کا جذبہ رکھنے والے لوگ رقوم و اشیاء ضروریہ کی شکل میں تعاون کرتے

(۱) رد المحتار ۲/۵۸، ۵۹، طبع احیاء التراث العربی بیروت۔

ہیں۔ بعض اوقات ضرورت مندوں میں تقسیم امداد کے بعد کچھ رقم بچ بھی جاتی ہے جو اسی طرح کی آئندہ ضرورت کے لئے محفوظ رہتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک غور طلب سوال یہ ہے کہ کیا از روئے شریعت ریلیف کی باقی ماندہ رقم میں سے کسی اور رفاہی، فلاحی اور اجتماعی ضرورت کے لئے اس شرط پر قرض دیا جاسکتا ہے کہ آئندہ ریلیف کی ضرورت کے وقت لازماً قرض کی واپسی کا انتظام کیا جائے گا اور اس کے واضح قرائن بھی موجود ہوں، جزاک اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

الجواب وبالله التوفیق

اصول یہ ہے کہ جو رقوم اور اشیاء ضروریہ جس مصرف کے لئے جمع کی جائیں، اسی مصرف پر خرچ کی جائیں، دوسرا اصول یہ بھی ذہن نشین رہنا چاہئے کہ اس طرح کی اپیلیں جن ہنگامی حالات کے لئے کی جاتی ہیں انہیں ہنگامی ضرورت پر صرف ہونی چاہئے، والا یہ کہ فوری ضرورت کے علاوہ مستقبل کی ضروریات کا بھی اپیل میں تذکرہ کیا جائے۔

بہر حال جو رقوم کسی ہنگامی صورت حال میں برائے ریلیف و راحت رسانی جمع کی جائیں اور اگر اس وقت کی ضرورت کے پورا کرنے کے بعد کچھ رقم بچ جائے تو یہ بجی ہوئی رقوم اس طرح کی کسی مستقبل کی ضرورت کے لئے محفوظ رکھی جائیں، یا پھر کسی قریب ترین مد پر مصرف کی جائیں۔ قرض کی جو صورت سوال میں مذکور ہے، بوقت ضرورت اور بشرط احتیاط جائز ہے، لیکن یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ہمدردی و راحت رسانی جو رقم آتی ہو، ضرورت مندوں کے رہتے ہوئے بھی ان کو نہ دے کر مستقبل کی ضرورت کے نام پر پیسے جمع رکھ لئے جائیں یہ جائز نہیں ہے، یہ امر بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ اعتبار جنس ضرورت کا ہے، مثلاً سیلاب زدگان کی مدد، فساد زدگان کی مدد، ہو سکتا ہے کہ ایک خاص شہر میں سیلاب آنے پر سیلاب زدگان کی مدد کے لئے امداد طلب کی گئی ہو اور اسی طرح کا سیلاب دوسری جگہ بھی آجائے، بظاہر حال معطلی کی نیت سیلاب کی وجہ سے مصیبت زدگان کی امداد و اعانت کرنا ہے، شہر یا علاقہ کی تبدیلی سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، والا یہ کہ معطلی کی طرف سے ایسی کوئی خاص صراحت موجود ہو، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب العشر

(الف) کیا ہندوستان کی موجودہ اراضی پر عشر واجب ہے؟

(ب) عشر وزکاة کی ادائیگی اجتماعی ہو یا انفرادی؟

ہندوستان میں عام طور پر جتنی زمینیں مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں وہ غیر مسلموں سے خریدی یا کسی صورت سے حاصل کی گئی ہیں اور اس کا بین ثبوت بھی موجود ہے، کیا ایسی زمینوں پر عشر واجب ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس کی شرح کیا ہوگی؟ نیز اس کے زیادہ مستحق انفرادی طور پر لوگ ہوں گے یا کوئی خاص ادارہ ہوگا؟

الجواب وبالله التوفیق

(الف) یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ ہندوستان میں عام طور پر جتنی زمینیں مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں، وہ غیر مسلموں سے خریدی گئی ہیں، یا کسی اور طرح حاصل کی گئی ہیں، ہاں اگر حاصل کی گئیں سے آپ کا مطلب مسلم فاتحین کی مفتوحہ اراضی کا حصول ہے تو صحیح ہے، لیکن جن اراضی کو مسلم فاتحین نے فتح کر کے غنائم پر تقسیم کر دیا وہ ظاہر ہے کہ عشری ہیں، بلکہ محقق علماء کی رائے یہ ہے کہ ہندوستان کی زیادہ تر اراضی عشری ہیں، یا ایسی ہیں جن کا حال معلوم نہیں اور پہلی صورت میں تو عشر واجب ہوگا ہی، دوسری صورت میں بھی عشر واجب ہوگا، جب کہ وہ اراضی مسلمانوں کے قبضہ میں ہوں، اس لئے کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ مسلمانوں کے لئے مناسب حال عشر کا وجوب ہی ہے اور عموماً نص بھی اسی کی متقاضی ہیں، ہاں اگر کوئی خاص ایسی زمین ہو جس کے بارے میں علم قطعی حاصل ہو کہ وہ غیر مسلموں سے خریدی گئی ہے تو ایسی صورت میں اس پر عشر واجب نہیں ہوگا“ (۱)۔

(۱) یہ موضوع تفصیل طلب ہے، اس پر کتابیں بھی لکھی گئی ہیں اور اس موضوع پر سمینار بھی ہو چکا ہے، دیکھئے: کتاب عشر والزکاة ۲۳۳، جواہر الفقہ، کفایت المفتی ۲۳۹۹، ۳۰۲، فتاویٰ دارالعلوم ۶/۱۶۲، ۱۶۳، امداد الفتاویٰ ۲/۵۹، مجلہ فقہ اسلامی بعنوان اراضی ہند کی شرعی حیثیت اور اسلام کا نظام عشر وخراج۔

(ب) عشر ہو یا زکاة، اس کی ادائیگی انفرادی طور پر اسلام کے مزاج اور نظام زکاة کی روح کے خلاف ہے۔ قرآن میں حضور ﷺ کو حکم دیا گیا: ”تُخَذُ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةٌ“ (۱) (آپ لیجئے ان کے اموال سے صدقہ) اور حدیث شریف میں آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ کو جب امیر بنا کر یمن بھیجا تو فرمایا: ”تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَاءِهِمْ وَتُرَدُّ عَلَىٰ فَقَرَاءِهِمْ“ (۲) (ان میں سے جو مالدار اور غنی ہیں ان سے لے کر ان کے فقراء پر خرچ کیا جائے گا)۔ ان تمام تعلیمات اور زکاة کے مصارف کے بیان میں ”وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا“ کا ذکر، یہ سارے امور وہ ہیں جو زکاة کی اجتماعی ادائیگی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ بہار و اریہ میں یہاں مسلمانوں کی شرعی امارت اور ان کے شرعی بیت المال کا نظام قائم ہے، مسلمانوں کے لئے انفرادی عمل کی کوئی گنجائش نہیں ہے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱) سورہ توبہ ۱۰۳۔

(۲) پوری حدیث صحیح بخاری میں ہے: ”أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَ مُعَاذًا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ إِلَى الْيَمَنِ لِقَالَ: ... فَاعْلَمَهُمْ أَنَّ اللَّهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِي أَمْوَالِهِمْ تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَاءِهِمْ وَتُرَدُّ عَلَىٰ فَقَرَاءِهِمْ“ (صحیح البخاری علی فتح الباری ۲/۲۶۱، حدیث: ۱۳۹۵)۔

کتاب الحج

حج کی ڈیوٹی پر بھیجے جانے والے کا حج

حسب ذیل مسئلہ میں شریعت حقہ کا حکم قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح فرما کر
ممنون فرمائیں، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے گا۔

ایک شخص حج کے ایام میں حج کی ڈیوٹی پر حکومت کی طرف سے جاتا ہے، لیکن
حکومت کا قانون حج کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے، کیا:
وہ شخص بغیر حج کیے ہوئے واپس آجائے، عند اللہ اس کا یہ فعل کیسا ہے؟
اور اگر وہ حج کرتا ہے تو اس حج کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب وبالله التوفیق

سوال میں مذکور صورت حال اور منسلک ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حجاج کی خدمت کے
لئے کچھ لوگوں کو بھیجا جاتا ہے، انہیں خود حج کرنے سے روکا گیا ہے، اور اس مضمون کا عہد بھی ان سے
لکھوایا جاتا ہے، ایسی صورت حال میں عہد کی پابندی لازم ہے، اور ایسے شخص کو حج نہیں کرنا چاہیے،
لیکن وہ بغیر احرام میقات میں داخل نہیں ہو سکتا، اور احرام عمرہ یا حج سے ہی ختم ہوگا، لہذا سرکار کی
طرف سے یہ پابندی درست نہیں ہے، لیکن جب تک یہ پابندی ہے شخص مذکور احرام باندھ کر داخل
ہو اور عمرہ کرے پھر وہ حجاج کی خدمت میں لگ جائے، یہ بات واضح رہے کہ باوجود اس ممانعت
کے اس نے حج کر لیا تو حج صحیح ہوگا۔

جس نے اپنا حج فرض ادا نہ کیا ہو، کیا وہ حج بدل کر سکتا ہے؟

ایک شخص جس نے اپنا حج فرض ادا نہیں کیا ہے، وہ حج بدل کر سکتا ہے یا نہیں؟ اگر
وہ حج بدل کرتا ہے تو کیا "مَنْ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا" کے تحت اس پر حج فرض

ہو جاتا ہے اور وہ تارک فرض قرار پائے گا؟ بینوا تو جروا۔

الجواب وبالله التوفیق

بہتر تو یہی ہے کہ حج بدل کے لیے ایسے شخص کو بھیجا جائے جس نے اپنا حج فرض ادا کر لیا
ہے، لیکن اس شخص کو بھی بھیجا جاسکتا ہے جس نے حج نہیں کیا ہے، اور حج آمر کی طرف سے ادا
ہو جائے گا، جیسا کہ فتاویٰ ہندیہ میں ہے: "والأفضل للإنسان إذا أراد أن يحج رجلا عن
نفسه أن يحج رجلا قد حج عن نفسه، ومع هذا لو أحج رجلا لم يحج عن نفسه
حجة الإسلام يجوز عندنا وسقط الحج عن الأمر، كذا في المحيط" (۱)۔

اور آیت قرآنی "وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا" (۲) کے
تحت وہ مستطیع قرار نہیں پائے گا اور نہ اس پر حج فرض ہوگا، اس لئے کہ وہ آمر کے خرچ سے وہاں تک
پہنچا ہے، چنانچہ حاشیہ مناسک ملا علی قاری میں ہے: "وقال العلامة طاهر سنبل: وكذا لا
يثبت الاستطاعة ببذل غيره الزاد والراحلة حتى لا يجب عليه الحج عندنا، وعند
الشافعي يجب، ولو امتنع عن البذل يجبر عليه بعد إحرام المبدول له، وقبله لا
يجبر، والصحيح قولنا، لأن الاستطاعة لا تثبت إلا بالملك وهو لا يثبت بالبذل
والإباحة، لأن للمبيح قدرة المنع عن البذل كذا في المحيط" (۳)۔

(۱) الفتاویٰ الہندیہ ۱/۲۵۷۔

(۲) سورۃ آل عمران ۹۷۔

(۳) ارشاد الساری علی ہاشم مناسک ملا علی قاری ۵/۳۶۰۔

کتاب البیوع

دو ملکوں کی کرنسیوں کی خرید و فروخت

زید نے بمبئی میں عمرو کو ایک لاکھ روپے دیئے اور دونوں میں یہ طے پایا کہ آج کے دن کویت میں جو نرخ کویتی دینار اور ہندوستانی روپے کے باہمی تبادلہ کا ہوگا، اس نرخ کے مطابق عمرو زید کو جب وہ کویت پہنچیں گے، کویتی دینار ادا کریں گے، عمرو کا کہنا ہے کہ اس نے کویت فون کر کے اپنے لڑکے کو کہہ دیا کہ آج کے دن جو نرخ ہو اس کے مطابق ایک لاکھ روپے کے متبادل کویتی دینار کا چک تیار کر کے رکھ دو۔ اور جب زید جائیں تو انہیں حوالہ کر دو، اسی دوران کویت پر عراق کا حملہ ہوا، زید نہیں جاسکے، اور سارے ہی کویتی دینار بے قیمت ہو گئے۔ عمرو اور اس کا لڑکا سب کچھ چھوڑ کر ہندوستان واپس آ گئے، اب یہ سوال ہے:

”کیا زید کی دی ہوئی رقم روپے کی شکل میں عمرو کو واپس کرنی پڑے گی یا جو چک زید کے نام لکھا گیا تھا جو بے قیمت ہو گیا، یہ زید کا نقصان ہو یا عمرو کا پیسہ ضائع گیا، ممکن ہے کہ موجودہ حالت میں کویتی دینار پھر بازار میں چلنے لگے تو کیا زید کے روپیوں کی قیمت کویتی دینار میں موجودہ نرخ کے اعتبار سے ادا کی جائے گی؟ براہ کرم حکم شرعی سے آگاہ کیا جائے۔“

الجواب وباللہ التوفیق

زید نے عمرو کو ایک لاکھ روپے آج ادائیگی کے دن کی قیمت پر کویتی دینار کے عوض فروخت کیا، لیکن وہ کویتی دینار اسے ادا نہیں کر سکا۔ چک کاٹ دینا ادائیگی نہیں۔ اولاً تو چک اسے حوالہ نہیں کیا، دوسرے یہ کہ چک بینک میں کیش ہو کر جب تک دوسرے شخص کے اکاؤنٹ میں نہیں

آجائے، ادائیگی شمار نہیں کیا جائے گا، چک کی حیثیت اصل روپے کی نہیں ہے، بسا اوقات اگر چک دینے والے کے اکاؤنٹ میں اتنے روپے نہیں ہوں تو چک DISHONER ہو جاتا ہے، لہذا صورت مسئلہ میں عمرو پر واجب ہے کہ وہ ایک لاکھ روپے زید کو واپس کر دے، جو کویتی دینار، حالیہ انقلاب کے دوران بے قیمت ہو کر ضائع ہوئے وہ عمرو کی ملکیت میں رہ کر ضائع ہوئے، اس لئے اس کی ذمہ داری عمرو پر ہے، زید پر نہیں، اور معاملہ اس روز کی قیمت پر طے تھا جس روز زید نے ایک لاکھ روپے عمرو کو دیئے تھے، لہذا کویتی دینار کی موجودہ قیمت کا اعتبار نہیں ہوگا (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

جانور کی وزن سے خرید و فروخت

ہمارے دیار میں جانور (زندہ) وزن سے بکتے ہیں اور بغیر وزن کے بھی فروخت ہوتے ہیں، بغیر وزن کے خریدنے میں خریدار کو جانور بہت گراں پڑتا ہے اور خریدار کو جانور جانچنے کا سلیقہ نہیں ہوتا، فروخت کرنے والے جانور میں جب گوشت بہت کم دیکھتے ہیں تو بغیر وزن کے فروخت کرتے ہیں، خریدار کو تجربہ نہیں ہوتا اور بھیڑ میں اون بہت زیادہ ہونے پر وہ بہت بڑا معلوم ہوتا ہے، دھوکا میں آ کر خرید لیتا ہے، ذبح کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ دھوکا ہوا ہے، آج کل ایسے واقعات بہت کثرت سے ہوتے ہیں کہ تین سو رائٹڈ میں بھیڑ خرید اتوار کو گوشت نکلا، گویا گوشت کا حساب کیا جائے تو فی کلو بتیس، تینتیس رائٹڈ پڑا،

(۱) "لو استدان نقداً معلوماً ثم كسد قبل الأداء فعند أبي حنيفة يجب رد مثله ولو كان كاسداً، لأنه هو الشابت في الذمة لا غيره وعند محمد وبعض الحنابلة يجب على المدين رد قيمة النقد الذي وقع به التعامل من النقد الآخر وقت الكساد وعند أبي يوسف والحنابلة والمالكية: لا يحزى رد المثل بعد ما كسد ويجب على المدين رد قيمة النقد الذي وقع عليه العقد يوم التعامل من نقد آخر" (هذا مختصر من الفتاوى السنية ۲۲۵/۳، بدائع الصنائع ۷/۳۲۴، مجموع رسائل ابن عابدین ۲/۲۶۶ وغیره)۔

ورنہ عام طور پر گوشت چودہ سے بیس رائٹ کلو تک فروخت ہوتا ہے، یہ حقیقت بالکل بجا ہے کہ امر الہی کی تعمیل کے وقت گوشت وغیرہ کا حساب نہیں لگانا چاہئے، مگر غیر مسلموں کی دھوکا دہی سے عامۃ المسلمین کو بچانا ضروری ہے کہ نہیں؟ اور جب وزن سے خریدنے میں مسلمانوں کو نقصان سے بچانا مقصود ہو تو کیا وزن سے خریدنے کی شرعاً اجازت ہو سکتی ہے؟ بینوا تو جروا۔

الجواب وبالله التوفیق

جانور عرف عام میں عددی شمار کئے جاتے رہے ہیں، اب عرف میں تبدیلی آئی ہے اور جانوروں کی بیع وزنا بھی ہونے لگی ہے، خود ہندوستان میں بھی کم از کم مرغیوں کی حد تک شہروں میں وزن کر کے بیچنے کا رواج ہو چلا ہے (۱)، مسئلہ زیر بحث ”بیع لحم بالحوان“ کا نہیں ہے، جو شیخین کے یہاں جائز اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ناجائز ہے (۲)، یہاں روپیہ دے کر جانور وزن کے حساب سے خریدنا ہے، نہ یہاں اتحاد جنس و قدر ہے کہ اس میں شبہ رہا ہو اور نہ کوئی غرر ہے، نہ کوئی ایسی جہالت ہے جو مفحشی الی المنازعت ہو، لہذا اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں، بیع جائز ہے، واضح رہے کہ یہاں بیع گوشت کی نہیں، بلکہ پورے جانور کی ہے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱) جن اشیاء کے بارے میں شریعت کی طرف سے کوئی صراحت نہ ہو کہ یہ وزنی ہیں یا کیلی تو وہ اہل شہر کے عرف کے مطابق خرید و فروخت کی جائیں گی، اور عرف کی تبدیلی کی صورت میں خرید و فروخت کے طریقہ میں بھی تبدیلی ہونی چاہئے، علامہ عینی نے ”عمدة القاری“ میں ”کیلی و وزنی“ کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے: ”کسل شیء لم یمنص علیہ الشارع انه کیلی او وزنی یعمل فی ذلک علی ما یعارفہ اهل تلك البلدة... لان الرجوع الی العرف جملة من القواعد الفقہیة“ (اعلاء السنن ۱۳/۹۷ طبع پاکستان بحوالہ عمدة القاری ۵/۵۶۳)، مزید دیکھئے: نظام الفتاویٰ ۱/۲۴۵۔

(۲) اس اختلاف کی تفصیل کے لئے دیکھئے: فتح القدر مع الہدایہ ۷/۲۶، ۲۷، طبع دار الکتب العلمیہ بیروت، الدر المختار مع رد المحتار ۷/۳۱۔

باب المضاربة

مضاربت کے ذریعہ کاروبار

کیا فرماتے ہیں مفتیان دین مسائل ذیل میں:

۱- متین احمد اور عبدالاحد نے مل کر آج سے ڈیڑھ سال قبل ”ڈیٹا بیس کمپیوٹر سسٹمز“ نام کی کمپیوٹر فرم شروع کی تھی، جس کی شکل یہ تھی کہ کمپیوٹر اور اسٹیشنری سامان کا سرمایہ جو کہ تین بیس ہزار سات سو روپیوں کا بنتا تھا یہ متین احمد کا ہوگا اور عبدالاحد صرف محنت کرے گا، فرم سے جو بھی نفع ہوگا دونوں میں آدھا آدھا تقسیم کیا جائے گا، اگر نقصان ہو تو متین احمد ہی برداشت کرے گا۔

آج ڈیڑھ سال بعد عبدالاحد یہ معاہدہ توڑ کر الگ ہونا چاہتا ہے، جب کہ عبدالاحد کے مطابق اب تک کا نفع ستائیس ہزار روپیوں کا ہوا ہے، لہذا ستائیس ہزار کا نفع آدھا آدھا کیا جائے۔

دوسری طرف متین احمد کا کہنا ہے کہ کمپیوٹر کی قیمت پرانی ہونے کی وجہ سے گر گئی ہے اور اسٹیشنری سامان استعمال ہو چکا ہے، اس لئے تین بیس ہزار سات سو کا جو سرمایہ ہے اس کو پہلے نقد کیا جائے، اگر نقد کرنے کے بعد تین بیس ہزار سات سو روپے میں کمی آتی ہے تو نفع کی رقم سے اس کی بھر پائی کی جائے، اس کے بعد جو بھی نفع بیچ جاتا ہے اس کو آدھا آدھا تقسیم کیا جائے۔

۲- اسی کاروبار کے درمیان تقریباً ۶، ۷ ماہ قبل عبدالاحد نے اس فرم کا نام جو ”ڈیٹا بیس کمپیوٹر سسٹمز“ تھا، تبدیل کر کے ”ڈیٹا بیس کمپیوٹرز اینڈ ڈیٹا کیوئی کیشن سسٹمز“ رکھا، پھر اسی نام سے لائسنس، رسیدیں اور لیٹر پیڈ بھی بنالیا، پھر آرڈر کے مطابق باہر سے سامان خرید کر فرم میں یکجا کیا اور پھر ایک سال کی ذمہ داری پر اسی فرم کے ذریعہ فروخت کیا۔ متین احمد یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کاروبار میں وہ برابر

کا شریک ہے، کیونکہ کاروبار کے لئے جگہ، ٹیلی فون اور کمپیوٹر یہ ساری امانتیں متین احمد کی ہی استعمال ہو رہی تھیں۔

اب دریافت طلب بات یہ ہے کہ مذکورہ دونوں صورتوں میں نفع کس طرح تقسیم ہوگا؟

۳- زید اور سعد نے مل کر کمپیوٹر کلائز شروع کی تھی، اس کی نوعیت یہ تھی کہ زید کا پورا مال ہوگا اور وہ ساری چیزوں کا مالک ہے جب کہ سعد اس کلاس میں پڑھانے اور سنبھالنے کا کام کرے گا، یہاں منافع کی تقسیم یوں ہوگی کہ جو بھی رقم آئے گی برابر تقسیم ہوگی اور نقصان صرف رب المال کا ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ سعد اس کاروبار سے الگ ہونا چاہتا ہے تو الگ ہونے کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب وبالله التوفیق

آپ کے سوال کی عبارت سے ہم ایسا سمجھتے ہیں:

۱- ڈیٹا بیس کمپیوٹر سسٹم نامی فرم قائم کرتے وقت آپ کے اور عبدالاحد صاحب کے درمیان یہ طے پایا کہ اس فرم کے لئے کمپیوٹر اور اسٹیشنری پر تینیس ہزار سات سو روپے خرچ ہوں گے جو آپ کو دینا ہوگا اور اس فرم کو چلانے کا کام عبدالاحد صاحب کریں گے، بنیادی سرمایہ تینیس ہزار سات سو روپے آپ نے دیئے جس سے کمپیوٹر وغیرہ دیگر ضروری سامان خریدے گئے اور عبدالاحد صاحب نے اس کو چلایا، اس کے نتیجے میں ستائیس ہزار روپے کی آمدنی ہوئی، یہ فرم قائم کرتے وقت یہ معاہدہ ہوا تھا کہ منافع آدھا آدھا ہوگا، اگر کوئی نقصان ہوا تو وہ آپ کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اگر معاملہ کی یہی صورت ہے جو ہم نے سمجھی ہے تو یہ مضاربت ہے، آپ "رب المال" ہیں، عبدالاحد "مضارب" ہیں، تینیس ہزار سات سو کا سرمایہ نقد "مال مضاربت" ہے (۱) اور ۲ ہزار

(۱) مضاربت "ضاربہ له في المال وبالمال" سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے: کسی کے مال سے تجارت کرنا اور نفع میں شریک ہونا، حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ نے بھی تقریباً یہی تعریف کی ہے کہ رب المال مضارب کو اس شرط پر مال دے کہ وہ محنت و مزدوری کر کے جو منافع حاصل کرے گا اس میں دونوں شریک ہوں گے، عسرفہا

روپے منافع ہوئے، اصول مضاربیت کے مطابق "مضارب شروع میں امین ہوتا ہے اور بعد کو شریک ہوتا ہے" (۱)۔

اب جب کہ یہ معاہدہ ختم ہوتا ہے، کمپیوٹر اور فرم کے دیگر سامانوں کی قیمت لگائی جائے اور اس کو ستائیس ہزار منافع کے ساتھ جوڑ دیا جائے، اس میں سے تینیس ہزار سات سو روپے اصلی پونجی آپ کو بحیثیت رب المال واپس کیا جائے، باقی جو بچ جائے وہ منافع قرار پائے گا، اس میں آپ دونوں آدھے آدھے کے حصہ دار قرار پائیں گے۔

۲- "ڈیٹا بیس کمپیوٹر سسٹم" فرم کا نام تبدیل کر کے "ڈیٹا بیس کمپیوٹر اینڈ ڈیلی کیو نی کیشن سسٹم" رکھنا اس سے حقیقت اور حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی جب کہ آرڈر کے مطابق سامان خرید کر کے اسی فرم کے ذریعہ سامان سپلائی کیا گیا، اسی فرم کی جگہ، فون اور کمپیوٹر اس نئے کاروبار کے لئے استعمال کیا گیا تو یہ سابق معاملہ کا ہی ایک حصہ مانا جائے گا اور اس کے منافع بھی ہر دو کے مابین برابر تقسیم ہوں گے۔

= الحنفیہ بانہا شركة في الربح بمال من جانب وعمل من جانب" (رد المحتار ۸/۲۳۰، مجمع الأنهر ۲/۳۲۱)۔

وعرفها المالكية بانها: تمكين مال لمن يتجره من ربحه" وعرفها الشافعية بانها: أن يدفع إليه مالا ليتجر فيه والربح مشترك" (رد المحتار ۸/۲۳۰، طبع بيروت بحوالہ أسهل المدارك ۲/۳۳، الإشراف ۲/۷)، لیکن حنابلہ نے مزید قید لگاتے ہوئے یہ تعریف کی ہے: مضاربت یہ ہے کہ صاحب مال اپنے مال کی ایک خاص مقدار کسی کے حوالے اس شرط پر کر دے کہ وہ اس مال سے تجارت کرے اور اس کے نفع میں سے ایک مقررہ حصہ کا وہ شریک ہوگا، اس میں ضروری ہے کہ سرمایہ نقدی سکون کی شکل میں ہو، "ہی دفع مال وما في معناه معين معلوم قدره إلى من يتجر فيه جزء معلوم من ربحه له أو لعبد له أو لأجنبي مع عمل منه" (المغنی ۵/۵۲، بحوالہ رد المحتار ۸/۲۳۰، کتاب الفقہ علی المذاہب الأربعة، باب المضارب)۔

(۱) قال صاحب الكافي: "المضارب أمين أولاً وإذا ربح فهو شريك فيه لتعلقه جزئاً من المال بعمله" (الهداية مع البنای علی فتح القدر ۸/۳۶۸)۔

جو گفتگو عبدالاحد اور متین کے درمیان اس معاملہ کے بارے میں سوال میں لکھی گئی ہے، وہ متفق علیہ نہیں ہے۔ مزید برآں یہ کہ پوری فرم جس کاروبار کے لئے استعمال کی گئی ہے، اصولی طور پر اس فرم کے اصل مالک کو اس کے منافع سے محروم رکھنا خلاف عدل ہے۔

۳- زید اور سعد نے مل کر جو باہم معاہدہ کیا اگر دونوں اس معاہدہ کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو چاہئے کہ اب تک کی آمدنی کو برابر برابر تقسیم کر لیں، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب القضا یا المعاصرہ

(مروجہ معاملات کے احکام)

قرض پر کرنسی کی قیمت گرنے کا اثر

مجلہ بحث و نظر (جنوری تا مارچ) میں کرنسی (Currency) کے تعلق سے فکر انگیز مضمون شائع ہوا ہے، اس سلسلہ میں سود سے متعلق ایک بات کھلتی ہے، آپ جانتے ہیں کہ فی زمانہ اشیاء کی قیمتیں کس تیزی سے بڑھ رہی ہیں، گویا جست لگا کر اوپر کی طرف جارہی ہیں، لہذا کرنسی یا روپے کی آج جو قوت خرید ہے وہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتی چلی جاتی ہے، سود کو حرام قرار دینے کا مقصد روپے سے روپے کمانے یا نفع اٹھانے سے روکنا ہے، لیکن آج بغیر سود کے کسی کو قرض دیں اور ایک مدت کے بعد واپس حاصل کریں تو اس رقم کی قوت خرید اتنی گر جاتی ہے کہ نفع نہ اٹھانے کی بات سے قطع نظر لامحالہ النافقان اٹھانا پڑتا ہے اور قرض دینے والا خسارے میں رہتا ہے، کیا اس صورت حال کا کچھ مداوا ہو سکتا ہے؟ یا اس خسارے کو برداشت کرنا ہے؟

متذکرہ نقصان وہ صورت حال سے ایک حد تک بچ نکلنے کے لئے کیا یہ بات جائز ہے کہ قرض دینے والا بجائے نقد رقم کے، سونے کی شکل میں اس شرط پر قرض دے کہ مدت قرض ختم ہونے کے بعد اسی معیار اور اسی وزن کا سونا واپس کیا جائے چاہے مدت قرض کتنی ہی کیوں نہ ہو؟

الجواب وبالله التوفیق

آپ کا سوال ”کرنسی کی قیمتوں کے کم ہونے سے متعلق“ ہے، یہ بات بالکل جائز ہے کہ بجائے کرنسی کے قرض میں سونا یا چاندی دیا جائے اور مدت پوری ہونے پر اسی مقدار میں سونا یا چاندی واپس لیا جائے، ایسا نہ ہو کہ دیا جائے روپیہ اور متعین کیا جائے سونا یا چاندی، جو دیں وہی لیں، اور قرض کی حد تک جائز ہے بیع میں نہیں، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

دلال کی اجرت

زمین کی خرید و فروخت میں زمین بیچنے اور خریدنے والے کے علاوہ ایک تیسرا فریق دلال بھی ہوتا ہے جو زمین بیچنے والے اور زمین خریدنے والے میں رابطہ قائم کراتا ہے، اس کے عوض میں وہ کچھ رقم (دلالی) لیتا ہے۔ اس رقم کا پتہ زمین خریدنے یا بیچنے والے کے علم میں کبھی ہوتا ہے کبھی نہیں۔ کبھی یہ رقم زمین بیچنے یا خریدنے والے دونوں سے وصول کی جاتی ہے۔ اس کا پتہ کبھی دونوں فریق کو ہوتا ہے کبھی ایک فریق کو، زمین کی طرح دکان بیچنے اور خریدنے میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیا یہ دلالی کی رقم شرعی نقطہ نظر سے جائز ہے؟

الجواب وبالله التوفیق

دلالی کا عام رواج ہے۔ کثرت سے اس پر لوگوں کا عمل ہے، اس لئے کثرت تعامل کی بنیاد پر اس کی اجرت جائز قرار پائے گی۔ اگرچہ اصل کے اعتبار سے دلالی پر اجرت لینا جائز نہیں ہے۔ علامہ شامی لکھتے ہیں: ”تا تاریخانیہ میں لکھا ہے کہ دلال کے لیے اجر مثل یا وہ رقم جس پر اصحاب معاملہ کا اتفاق ہو جائے واجب ہوگی۔ مثلاً یہ کہ دس دینار میں اتنی رقم واجب ہوگی تو یہ حرام ہے اور حاوی میں ہے کہ محمد بن سلمہ سے دلال کی اجرت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ اگرچہ دلال کی اجرت اپنی اصل کے لحاظ سے فاسد ہے مگر کثرت تعامل کی وجہ سے اس کی اجازت ہونی چاہیے۔ بہت سی چیزیں جو ناجائز ہیں مگر بر بنائے حاجت انہیں جائز قرار دیا گیا ہے جیسا کہ حمام وغیرہ میں داخل ہونے کا مسئلہ ہے“ (۱)۔

(۱) "وقال فی التاتارخانیۃ: وفي الدلال والسمسار يجب اجر المثل، وما تواضعوا عليه أن فی کل عشرة دنایر کذا فذلک حرام علیہم وفي الحاوی: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان فی الأصل فاسداً لكثرة التعامل، وكثير من هذا غیر جائز فجوزوه لحاجة الناس إليه كدخول الحمام" (رد المحتار ۸/۹ طبع بیروت)۔

کیا یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا میں سرمایہ لگانا جائز ہے؟ اور غریبوں اور

محتاجوں کی مدد کے لئے سود پر رقم لگانا کیسا ہے؟

خدمت عالی میں گزارش یہ ہے کہ حکومت ہند کی جانب سے منظور شدہ ایک عوامی ادارہ ہے، جس کا نام ”یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا“ ہے، یہ ادارہ عوام کے فائدہ کے لئے وجود میں آیا ہے، یہ ادارہ عوام سے ان کا سرمایہ لے کر اس کو مختلف قسم کے کاروبار میں لگاتا ہے، پھر اس سرمایہ سے جو آمدنی ہوتی ہے اس میں سے ہر سال مالک سرمایہ کے سرمایہ پر کچھ فیصدی نفع طے کر کے اس کو سالانہ تقسیم کرتا ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ ادارہ کے منتظمین سرمایہ داروں کا سرمایہ جن کاروبار میں لگاتے ہیں ان میں سے اکثر سودی طریقہ پر لگاتے ہیں، اور ان کے کاروبار سے حاصل ہونے والا نفع شرعاً سود ہی ہوتا ہے، جیسا کہ کچھ سرمایہ کمپنیوں کے پریفرنس شیئرز اور ڈیپنڈنٹ شیئرز میں لگاتے ہیں اور کچھ سرمایہ سرکاری بینکوں کی فیکس ڈپازٹس اور بونڈس میں لگاتے ہیں اور کچھ سرمایہ سرکاری سودی سرٹیفکیٹ اور وکاس پٹروں میں لگاتے ہیں، بیمہ کا کاروبار بھی ہوتا ہے۔

اگر کوئی شخص غریبوں اور محتاجوں کی مدد کے لئے آمدنی کے ذرائع کھڑے کرنے کی غرض سے لوگوں سے چندہ کر کے سرمایہ جمع کرے اور اس چندہ کی رقم کو آمدنی حاصل کرنے کے لئے مذکورہ ادارہ ”یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا“ میں لگائے اور یونٹ ٹرسٹ سے جو نفع حاصل ہو اس کو محتاجوں میں تقسیم کرے تو سوال یہ ہے کہ اس غرض سے چندہ کرنا اور پھر اس کو مذکورہ یونٹ ٹرسٹ میں لگا کر اس سے نفع حاصل کرنا پھر نفع کی رقم سے غریبوں کی مدد کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق

آپ کی تحریر کے مطابق "پونٹ ٹرسٹ آف انڈیا" کا کاروبار سودی ہے اور وہ انہی سودی تجارتوں میں اپنا سرمایہ لگا کر سود بنام منافع کماتا ہے اور اپنے شیر ہولڈرس یا اپنے کھاتہ داروں کو بنام منافع کچھ آمدنی ادا کرتا ہے، اس سے قطع نظر کہ کھاتہ داروں کے ساتھ اس کا معاملہ سودی ہے یا غیر سودی۔ جب کہ ادارہ کھاتہ داروں سے جمع شدہ رقم کو سودی کاروبار میں لگا کر منافع کھاتہ داروں کو دیتا ہے تو یوں سمجھنا چاہئے کہ یہ ادارہ سودی کاروبار کے لئے گویا کھاتہ داروں کا وکیل اور ایجنٹ ہے اور سودی کاروبار اصلہ (براہ راست) یا وکالہ (بالواسطہ) کیا جائے، بہر صورت حرام ہے (۱)۔ دوسری بات لحاظ میں رکھی جانی چاہئے کہ کسی عمل کی حرمت اور بُرائی اس لئے دور نہیں ہو جائے گی کہ اس کا مقصد اچھا ہے اور نہ نیک مقصد کی خاطر حرام ذرائع کا استعمال کرنا صحیح ہے، کوئی چوری، ڈکیتی اور بدکاری اس لئے کرے کہ اس کی آمدنی سے غریبوں کی مدد کی جائے گی، ظاہر ہے کہ اسے صحیح نہیں کہا جائے گا، لہذا سوال میں مذکورہ چندہ اور پونٹ ٹرسٹ میں لگا کر منافع حاصل کرنا، چاہے اس کی آمدنی غریبوں کے لئے ہی ہو، جائز نہیں ہے (۲)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

حرام مال اور اس سے کمایا ہوا نفع

سب سے پہلے میں اپنا مختصر سا تعارف کراؤں، تاکہ آپ کو پتہ چلے کہ کس قسم کے شخص نے آپ سے مخاطبت کی ہے، میں ایک سنی مسلمان ہوں جو کچھ عرصہ پہلے تک اسلام کو پسند تو کرتا تھا مگر اسلامی زندگی سے کوسوں دور تھا۔ آخرت کی فکر

(۱) "عن ابن مسعود قال لعن رسول الله ﷺ أكل الربا وموكله وكتابه وشاهده" (سنن أبی داؤد ۶۲۸/۳ طبع استنبول) تفصیل کے لئے دیکھئے: الجامع لأحكام القرآن ۲۳۶/۳۔

(۲) "وفيه تفيد لقول الظهيرية: رجل دفع إلى فقير من المال الحرام شيئاً يرجو به الثواب يكفر — (إنما يكفر إذا تصدق بالحرام القطعي) أي مع رجاء الثواب الناشئ عن استحلاله كما مر" (الدر المختار مع رد المحتار ۲۱۹/۳)۔

کے سامنے دنیاوی فکر غالب تھی، ہر وہ چیز بے چوں و چرا کر گذرتا جس کو اللہ اور اس کے محبوب رسول ﷺ نے منع کیا تھا، لیکن تقریباً تین سال ہو گئے مجھ میں آہستہ آہستہ تبدیلی آنی شروع ہوئی اور اس سال رب العزت نے حج کی سعادت سے نوازا۔ مکہ میں میں نے آپ کی آمد کی خبر سنی، میں ان تین برسوں میں بڑا ہی پریشان رہا۔ ایک بات دل میں چبھ رہی تھی اور مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ کسی عالم سے رجوع کر کے اپنی چیخ کو دل سے نکال دوں، آپ سے ملنے کی بڑی خواہش تھی، مگر وقت ساتھ نہ دے سکا۔ البتہ آپ کا پتہ مجھے ایک دوست کے ذریعہ مل گیا جو آپ کو اچھی طرح جانتا ہے، میرے دل میں بہت سے سوالات اٹھ رہے ہیں جس کے جواب کا یہ ناچیز آپ سے طلب گار ہے، مجھے امید ہے کہ آپ مجھے ہرگز مایوس نہ کریں گے، اس کے لئے مجھے میری آپ بیتی ایک طرح سے عیب آپ پر ظاہر کرنی ہوگی، اس کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہیں ہے، ویسے ہمارے گاؤں میں علماء ہیں، مگر میں ان کے سامنے اپنا عیب ظاہر کر کے زندگی کے باقی دن ان کو منہ دکھانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا، اس لئے آج تک کانٹوں کے بستر پر کروٹیں بدل رہا ہوں۔

میری کہانی ۱۹۷۶ء سے شروع ہوتی ہے جب میں ذریعہ معاش کے لئے بڑی تکلیفیں اٹھا کر یہاں آیا تھا، تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود خاطر خواہ نوکری نہیں ملی، اس لئے ایک دکان میں Sales Man کی حیثیت سے کام مل گیا، ہمارا مالک بہت ہی اچھا آدمی تھا۔ دو تین مہینے میں ہی میں نے اپنے ایک دوست کو اسی دکان میں بلوایا، جب ہم یہاں آئے تھے تو ایک جوش اور ولولہ لے کر آئے تھے کہ ہم زندگی میں کچھ کر دکھائیں گے، ہم نے اپنی ہی دکان کھولنے کی سوچا، تنخواہ اتنی زیادہ نہیں تھی، اس لئے ہم نے اپنے محسن کے دکان سے چوری شروع کی، کافی رقم جمع کر کے اپنے تنخواہ کے پیسے کے ساتھ ملا کر ایک چھوٹی سی دکان لی۔ دکان

خوب چکی، اس دوران میں نے اسی چوری کے پیسوں سے ایک گھر بھی بنایا، پھر ہم دونوں نے نوکری چھوڑ دی اور کام میں جٹ گئے، ایک سے دو اور دو سے تین کرتے کرتے، آج ہماری سات دکانیں ہیں، ہم نے خوب ترقی کی ہے، سماج میں بہت عزت ہے، لیکن خدا کا کرنا ایسا ہو گیا کہ تقریباً تین سال ہو گئے میری یہ تجارت مجھے بوجہ محسوس ہونے لگی، میں دل ہی دل میں کڑھنے لگا، عذاب قبر اور جہنم کی آگ سے ڈر محسوس ہونے لگا، دل میں رنج ہونے لگا کہ یا اللہ یہ میں نے کیا کیا؟ حرام کی کمائی سے اپنے پیارے والدین، بیوی بچوں کی پرورش کر رہا ہوں، زکاۃ اسی میں سے دے رہا ہوں، صدقہ اسی سے کر رہا ہوں، یا اللہ مجھے کتنا بڑا عذاب ہوگا۔ سوچ کر ہی دل کانپنے لگا، اس وقت سے اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کی۔ آہستہ آہستہ، اللہ کے راستے کی طرف چل پڑا، نماز نہیں پڑھتا تھا گھر میں شروع کی، وہ غلط لگا تو مسجد میں پڑھنے لگا، قضا کیا کرتا تھا وہ بھی چھوڑ دیا، جماعت کا اہتمام نہیں تھا وہ بھی شروع کیا۔

تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے میرے گناہ کے لئے کفارہ ادا کرنا ہوگا؟ کیا میری نمازیں جو چھوٹ گئی ہیں وہ معاف نہ ہوئی ہوں گی؟ کیا اگر جتنا پیسہ میں نے چوری کیا ہے اتنا اگر نکال کر کسی غریب کو دوں تو معافی مل سکتی ہے؟ ورنہ میری کمائی کیا حلال نہ ہوگی؟

اب مجھے اگلا قدم کیسے اٹھانا ہے؟ اگر آپ مجھے جلد از جلد معلوم کرائیں تو عین نوازش ہوگی۔

الجواب وبالله التوفیق

سلام مسنون

مکرمی!

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا، حالات جان کر افسوس بھی ہوا اور خوشی بھی ہوئی۔ ماضی کے

حالات پر افسوس ہوا اور حال کی ندامت پر مسرت ہوئی، انشاء اللہ آپ کی توبہ اللہ قبول فرمائے گا، آپ میرا خط ملتے ہی پہلے اس کا تخمینہ کریں کہ بنیادی رقم جو مالک کے یہاں سے لی گئی وہ کتنی تھی، پھر اتنی رقم کا ڈرافٹ ایک مشنت یا متعدد اقساط میں بلا اظہار نام مالک کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دی جائے، اس طرح اصل واجب رقم سے بری الذمہ ہو جائیں گے۔

دوسرا مسئلہ اس نفع کا ہے جو اس آمدنی سے کمایا گیا ہے تو اگرچہ امام ابو یوسفؒ ضمان اور اصل مال کی ادائیگی کے بعد اس نفع کو جائز قرار دے دیتے ہیں، لیکن امام اعظمؒ اور امام محمدؒ کی رائے یہ ہے کہ یہ نفع ایک ذریعہ حرام و خبیث سے پیدا ہوا ہے، اس لئے یہ پاک نہیں ہو سکتا اور اس کا صدقہ کرنا واجب ہے اور یہی قول مفتی بہ ہے، اس لئے چاہئے یہ کہ اب تک جتنا نفع کمایا ہے اس کا تخمینہ کر لیں اور پکا ارادہ کر لیں کہ اتنی رقم آہستہ آہستہ صدقہ کر دیں گے، پھر ماہوار ایک قسط اپنے اوپر ادائیگی کے لئے لازم کر لیں اور پابندی کے ساتھ صدقہ کرتے رہیں، یہ صدقہ بہ نیت ثواب نہیں ہوگا، بلکہ اپنے کو پاک کرنے کی نیت سے ہوگا، انشاء اللہ میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فضل فرمائے گا، توبہ قبول فرمائے گا اور جو دکان، مکان اور دوسری املاک حاصل کی گئی ہیں، وہ حلال ہو جائیں گی، خلاصہ یہ کہ:

اولاً: مالک کے اصل سرمایہ کی ادائیگی جس کے لئے نام کا اظہار بھی ضروری نہیں۔

ثانیاً: اس مال حرام سے کمائے ہوئے نفع کو صدقہ کرنا، جس کے لئے حاصل کردہ منافع کی قیمت کا تخمینہ کرنا اور اتنے روپے آہستہ آہستہ قسط وار ادا کرنا۔

اور ان سب کے ساتھ ساتھ بار بار اللہ تعالیٰ سے بجزواری اور اس سے معافی طلب کرنا، اس سلسلہ میں فقہ کی مندرجہ ذیل عبارتوں کو پیش نظر رکھیں:

الغصب ... فی الشریعة أخذ مال متقوم محترم بغير إذن المالك علی وجه یزیل یدہ ... ثم إن كان مع العلم فحکمه المأثم والمغرم وإن كان بدونه فالضمان (۱)۔

ومن غصب ألفاً فاشتری بها جارية فباعها بألفین ثم اشتری بالالفین

جارية فباعها بثلاثة آلاف درهم، فإنه يتصدق بجميع الربح، وهذا عندهما وأصله أن الغاصب أو السودع إذا تصرف في المغصوب أو الوديعة وربح لا يطيب له الربح، عندهما خلافاً لأبي يوسف وقال مشائخنا ولا يطيب له قبل أن يضمن وكذا بعد الضمان بكل حال، وهو المختار لإطلاق الجواب في الجامعين والمبسوط (۱)۔

لأبي يوسف أنه حصل في ضمانه وملكه، أما الضمان فظاهر، وكذلك الملك في المضمون لأن المضمونات تملك بأداء الضمان مستنداً إلى وقت الغصب عندنا، ولهما أنه حصل بسبب خبيث وهو التصرف في مال الغير وما هذا حاله فسيله التصدق، إذا الفرع يحصل على وصف الأصل والملك المستند ناقص فلا يندم به الخبث (۲)۔

خلاصہ ان عبارتوں کا یہ ہے کہ ”مالک کی اجازت کے بغیر مال مقوم و محترم لے لینا، اس طرح کہ اصل مالک کا قبضہ ختم ہو جائے“ غصب ہے، اگر جان بوجھ کر دوسرے کا مال لے لیا تو گنہگار بھی ہوگا اور ضمان بھی دینا ہوگا اور اگر غلطی سے بغیر علم کے کسی کا مال لے لیا ہو تو ضمان دینا ہوگا، گناہ نہیں ہوگا۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی نے کسی کے مثلاً ہزار روپے غصب کر لئے اور ان ہزار روپیوں سے کوئی سامان تجارت خرید لیا اور اسے فروخت کر کے دو ہزار بنا لئے، پھر اور مال خریدا اور اس سے مزید نفع کمایا تو اصل مالک کو اسے ضمان دینا ہوگا ہی، ساتھ ہی ساتھ یہ پورا نفع بھی اسے صدقہ کر دینا ہوگا، یہ مسلک امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کا ہے، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک منافع کا صدقہ کرنا واجب نہیں، بلکہ ضمان ادا کرنے کے بعد یہ منافع اس کے لئے حلال ہو جائیں گے، مشائخ علماء احناف کا کہنا یہ ہے کہ ضمان ادا کرنے سے پہلے بھی اور ضمان ادا کرنے کے بعد بھی یہ منافع اس کے لئے پاک نہیں ہوں گے اور یہی قول مختار ہے۔

(۱) ہدایہ ۳/۵۶۲۔

(۲) ہدایہ ۳/۵۵۵۔

امام ابو یوسفؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ منافع اسے اس مال کے ذریعہ حاصل ہوا ہے جس کا ضمان ادا کرنا اس کے لئے واجب ہے اور جس مال کا ضمان ادا کرنا پڑے وہ مال ادا ضمان کے بعد وقت غصب سے اس کی ملک قرار دیا جائے گا، امام اعظمؒ اور امام محمدؒ کا کہنا ہے کہ ذریعہ آمدنی حرام اور ناپاک ہے، اس لئے اسے صدقہ کرنا واجب ہے اور اصل مال حرام تھا، اس لئے فرع (منافع) بھی حرام ہوگا، رہا سوال ملک کا تو وہ ملک ناقص ہے، اس لئے اس کی وجہ سے اس کی ناپاکی دور نہیں ہوگی، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتاب النکاح

بیوی کی موجودگی میں اس کی بہن سے نکاح حرام ہے

لکھنا ضروری یہ ہے کہ جناب یونس صاحب کی بیوی دنیا میں زندہ ہے اور وہ اپنی سگی سالی سے شادی کرنا چاہتا ہے، یعنی اس نے سالی کو گھر والی بنا کر اس سے زنا بھی کیا ہے، یہ غلط معاملہ آج سے نہیں بلکہ ۶ رسال سے ہے اور یونس صاحب کا کہنا ہے کہ میں اس سے شادی کروں گا یعنی سالی سے۔ اس حال میں کیا کریں، شریعت میں اس کا حکم کیا ہے؟

الجواب وبالله التوفیق

ایک خاتون کے نکاح میں رہتے ہوئے اس کی بہن سے نکاح کرنا حرام ہے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا" (۱) (اور حرام ہے کہ اکٹھا کر دو، بہنوں کو مگر جو پہلے ہو چکا، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے)۔

اور جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "أَنْ أُمَّ حَبِيبَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ حَدَّثَهَا أَنَّهَا قَالَتْ لِرَسُولِ اللَّهِ يَا رَسُولَ اللَّهِ: انْكَحِ أُخْتِي عَزْرَةَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: "أَتَحْبِبِينَ ذَلِكَ" فَقَالَتْ: نَعَمْ يَا رَسُولَ اللَّهِ لَسْتُ لَكَ بِمُخْلِيةٍ وَاحِبٍ مِنْ شَرِّ كُنِي فِي خَيْرٍ أُخْتِي فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ: فَإِنْ ذَلِكَ لَا يَحِلُّ لِي" (۲) (حضرت ام حبیبہ ام المؤمنین نے آنحضور ﷺ سے کہا کہ آپ میری بہن عزہ سے نکاح کر لیں، تو حضور ﷺ نے پوچھا کہ کیا تم کو یہ پسند ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں، یا رسول اللہ! میں جانتی ہوں کہ میں تمہارا آپ کی

(۱) سورۃ نساء، ۲۳۔

(۲) الصحیح للبخاری ۶/۱۲۸، ۱۲۷، الصحیح لمسلم ۲/۱۰۷۳، حدیث ۱۳۳۹، طبع استنبول۔

زوجیت میں نہیں رہوں گی اور کسی خیر میں میرے ساتھ میری بہن شریک ہو، یہ میرے لئے زیادہ پسند ہے، تب حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ میرے لئے حلال نہیں)۔

اور ہدایہ میں ہے: "وَلَا يَجْمَعُ بَيْنَ أُخْتَيْنِ نِكَاحًا وَلَا بِمَلِكٍ يَمِينٍ وَطًا" (۱)۔
لہذا صورت مسئلہ میں مذکورہ شخص یونس کے لئے اپنی بیوی کے زندہ اور اس کی زوجیت میں موجود ہوتے ہوئے، بیوی کی بہن سے شادی کرنا شرعاً قطعاً حرام ہوگا، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

رضاعی بھائی بہن کا آپس میں نکاح حرام ہے

کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلہ ذیل میں:

حمیدہ خاتون کے پاس چھ لڑکے ہیں، محمد توقیر، حفظ الرحمن، محمد توفیق، محمد رضوان، محمد غفران اور محمد ذیشان۔

حمیدہ خاتون نے اپنی نند ریحانہ خاتون کے لڑکا برکت اللہ کو محمد توقیر جب دودھ پی رہا تھا اس وقت ایک دن دودھ پلایا تھا، اب حمیدہ خاتون اپنے بڑے لڑکے محمد توقیر کی شادی ریحانہ خاتون کی لڑکی سے جو برکت اللہ سے چھوٹی ہے کرنا چاہتی ہے۔ یہ رشتہ جائز ہے یا ناجائز؟ نیز یہ کہ برکت اللہ کی شادی توقیر کی کسی بہن سے ہو سکتی ہے یا نہیں۔

جواب قرآن و حدیث کی روشنی میں عنایت فرمائیں۔

الجواب وبالله التوفیق

رضاعت کے سلسلہ میں بنیادی طور پر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اگر کوئی بچہ مدت رضاعت میں کسی عورت کا دودھ پیتا ہے تو وہ بچہ اس عورت کا رضاعی بیٹا یا بیٹی اور وہ عورت رضاعی ماں ہو جاتی ہے، اور اس عورت کی تمام اولاد دودھ پینے والے بچے کے رضاعی بھائی بہن ہو جاتے ہیں، اس لئے اس بچہ کی شادی دودھ شریک بھائی بہن کا رشتہ قائم ہونے کی وجہ سے دودھ پلانے والی عورت کی

(۱) الہدایہ مع فتح القدیر ۳/۲۰۳، طبع بیروت۔

کسی بھی اولاد سے خواہ بڑی ہو یا چھوٹی، ایک ہی شوہر سے ہو یا دوسرے سے، شرعاً حرام ہوتی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَأُمَّهَاتُكُمُ الَّتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُم مِّن الرِّضَاعَةِ" (۱)۔

اور حدیث شریف میں ہے: "وَيَحْرَمُ مِنَ الرِّضَاعَةِ مَا يَحْرَمُ مِنَ النَّسَبِ" (۲)۔ نیز فتاویٰ ہندیہ میں ہے: "وَيَحْرَمُ عَلَى الرِّضِيعِ أَبَوَاهُ مِنَ الرِّضَاعِ وَأَصُولُهُمَا وَفُرُوعُهُمَا مِنَ النَّسَبِ وَالرِّضَاعُ جَمِيعًا حَتَّى أَنْ الْمَرْضُوعَةُ لَوْ وَلَدَتْ مِنْ هَذَا الرَّجُلِ أَوْ غَيْرِهِ قَبْلَ هَذَا الْإِرْضَاعِ أَوْ بَعْدَهُ فَالْكُلُّ إِخْوَةُ الرِّضِيعِ وَأَخَوَاتُهُ" (۳)۔

اور بدائع الصنائع میں ہے: "وَالْأَصْلُ فِي ذَلِكَ أَنَّ كُلَّ اثْنَيْنِ اجْتَمَعَا عَلَى ثَلَاثِي وَاحِدٍ صَارَا أَخَوَيْنِ أَوْ أُخْتَيْنِ أَوْ أَخًا وَأُخْتًا مِنَ الرِّضَاعَةِ فَلَا يَجُوزُ لِأَحَدِهِمَا أَنْ يَتَزَوَّجَ بِالْآخَرِ وَلَا يُولَدَ كَمَا فِي النَّسَبِ" (۴)۔

لہذا مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں صورت مسئلہ میں برکت اللہ نے چونکہ محمد توقیر کی والدہ کا دودھ پیا ہے، اس لئے برکت اللہ کی شادی محمد توقیر کی کسی بھی بہن سے خواہ بڑی ہو یا چھوٹی شرعاً نہیں ہو سکتی، البتہ محمد توقیر کی شادی برکت اللہ کی کسی بھی بہن سے خواہ بڑی ہو یا چھوٹی ہو سکتی ہے، جائز ہے: "وَأَحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَلِكَ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ" (۵)۔

"وَتَحِلُّ أُخْتُ أَخِيهِ رِضَاعًا كَمَا تَحِلُّ نِسَابًا مِثْلُ الْأَخِ لِأَبٍ إِذَا كَانَتْ لَهُ أُخْتُ مِنْ أُمِّهِ يَحِلُّ لِأَخِيهِ مِنْ أَبِيهِ أَنْ يَتَزَوَّجَهَا كَذَا فِي الْكَافِي" (۶)۔

(۱) سورۃ نساء، ۲۳۔

(۲) الصحیح للبخاری ۶/۱۲۴، باب ۲۰ طبع استنبول، الصحیح لمسلم ۲/۶۸، طبع استنبول۔

(۳) الفتاویٰ الہندیہ ۱/۳۳۳۔

(۴) بدائع الصنائع ۳/۳۔

(۵) سورۃ نساء، ۲۳۔

(۶) الفتاویٰ الہندیہ ۱/۳۳۳۔

اور بدائع الصنائع میں ہے: "وَيَجُوزُ لِلرَّجُلِ أَنْ يَتَزَوَّجَ أُخْتِ أَخِيهِ مِنَ الرِّضَاعِ وَهَذَا ظَاهِرٌ" (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

حالت حمل میں نکاح کرنے کا حکم

۱- کیا ایام حمل میں عورت سے نکاح جائز ہے؟

۲- حاملہ سے حالت حمل میں محمود نے نکاح کیا، چار پانچ ماہ کے بعد بچہ تولد ہوا تو کیا اسے پھر نکاح کرنا ہوگا، نکاح کی پھر کیا صورت ہوگی؟

الجواب وبالله التوفیق

۱- اگر حمل زنا سے ہو تو اس حمل کی حالت میں نکاح جائز ہوگا، لیکن جس کا حمل ہے اگر اس سے نکاح ہو تو وہ قربت بھی کر سکتا ہے اور دوسرے سے ہو تو وہ تا وضع حمل عورت سے قربت نہیں کر سکتا (۲)۔

۲- سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ حاملہ کو حمل محمود ہی سے تھا، اگرچہ یہ حمل حمل زنا تھا، پھر حالت حمل میں نکاح ہوا تو یہ نکاح درست ہوا، تجدید نکاح کی ضرورت نہیں (۳)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

تنہائی میں نکاح نامہ پر دستخط کرانے سے نکاح ہو جائے گا؟

زید نے ایک لڑکی سے تنہائی میں ایک نکاح نامہ پر دستخط کرایا، اس موقع پر زید اور لڑکی کے علاوہ کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا، بعد میں زید نے کسی مجلس میں

(۱) بدائع الصنائع للکاسانی ۶/۲۔

(۲) "صحیح نکاح (حلی من زنا لا) حلی (من غیرہ) (وان حرم وظوہا و دواعیہ حتی تضع) ولو نکحہا الزانی حل له وظوہا اتفاقاً والولد له" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۳۹، ۳۹، ۳۸، ۳۷)۔

(۳) طبع پاکستان۔

(۴) سابقہ حوالہ۔

گواہوں کی موجودگی میں قاضی سے نکاح پڑھوایا، کیا یہ نکاح منعقد ہو گیا؟ لڑکی اپنے بیان میں والدین سے کہتی ہے کہ میں نے لڑکے کے دباؤ میں آکر یہ سوچ کر دستخط کیا تھا کہ اس طرح تو نکاح ہوتا ہی نہیں ہے، لیکن لڑکی اب زید سے نکاح کرنا چاہتی ہے۔

الجواب وبالله التوفیق

سوال واضح نہیں ہے، اگر نکاح نامہ پر دستخط کی صورت یہ ہو کہ نکاح نامہ میں ایجاب اور قبول ہو تو بھی اس نکاح نامہ پر دستخط سے نکاح نہیں ہوگا، اس لئے کہ کوئی گواہ موجود نہیں ہے، بعد میں قاضی سے خطبہ پڑھا کر اگر لڑکے نے نکاح قبول کیا در انحالیکہ وہاں وہ لڑکی موجود نہیں تھی، نہ اس کا کوئی ولی تھا، نہ اس کا کوئی وکیل، تو ایسی صورت میں قاضی نکاح جس نے ایجاب کر لیا وہ محض فضولی تھا اور فضولی کا ایجاب معتبر نہیں، جب تک خود لڑکی اس کو منظور نہ کر لے (۱)، ان حالات میں مناسب یہ ہے کہ ایک درخواست قاضی شریعت دار القضاء جنوبی دہلی (یا اپنے علاقہ کے دار القضاء) کے پاس دی جائے اور دونوں فریق حاضر ہو کر اپنی اپنی پوری بات کہیں اور ان سب کو سامنے رکھ کر قاضی شریعت جو حکم شرعی دیں اس پر فریقین عمل کریں، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مطلقة بائنہ عدت گذرنے کے بعد نکاح کرے گی یا عدت کے اندر؟

مطلقة بائنہ سابق شوہر سے عدت کے اندر نکاح کرے یا انقضاء عدت کے بعد کرے اور اس کی عدت کیا ہے؟

الجواب وبالله التوفیق

مطلقة بائنہ (جو تین طلاق سے بائنہ نہ ہوئی ہو) عدت کے اندر اور عدت کے بعد بھی طلاق

(۱) "وقال في البحر: الفضولي من يتصرف لغيره بغير ولاية ولا وكالة... فإنه يتوقف على اجازة الزوج" (رد المحتار ۳/۷۹ طبع پاکستان) اور مزید تفصیل رد المحتار باب بیع الفضولی میں ہے۔

دینے والے شوہر سے نکاح ثانی کر سکتی ہے (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

سوتیلے ماموں سے نکاح جائز ہے

سوال یہ ہے کہ زید کی دو شادی ہوئی، محل ثانی سے ایک لڑکی ہے جو قابل شادی ہے، دوسری طرف ایک لڑکا ہے جو زید کے محل اولی مرحومہ کا سوتیلا بھائی ہے، یعنی لڑکا رشتہ میں ماموں ہوتا ہے، مگر دراصل سوتیلی ماں کا سوتیلا بھائی ہے، اب ایسی حالت میں ان دونوں میں شادی کا رشتہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ مزید وضاحت کے لئے عرض ہے کہ زید کی پہلی بیوی مرگئی اور دوسری شادی کیا جس سے یہ لڑکی ہے، ادھر زید کی اپنی ساس کے انتقال کے بعد ان کے سر نے دوسری شادی کر لیا جس سے وہ لڑکا ہے۔ شرع کے مطابق جو حکم ہو مطلع فرمائیں۔

الجواب وبالله التوفیق

صورت مذکورہ میں نکاح جائز ہے (۲)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱) "إذا كان الطلاق بائناً دون الثلاث، فله أن يتزوجها في العدة وبعد انقضاءها" (الهدایہ ۲۶۶۳ طبع پاکستان)۔

(نوٹ) طلاق دینے والے شوہر سے نکاح ثانی کرنے کی صورت میں تو عدت گزارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چاہے تو عدت کے اندر نکاح جدید کرے یا عدت پوری گذر جانے کے بعد بھی کر سکتا ہے، البتہ اگر کسی دوسرے مرد سے نکاح کرنا ہو تو عدت پوری گزارنے کے بعد ہی نکاح کر سکتی ہے، عدت حیض والی عورت کے لئے تین حیض، حاملہ کے لئے وضع حمل اور جس کا حیض آنا شروع ہی نہیں ہوا ہو یا جس کا حیض آنا ہو رہی ہو نے کی وجہ سے بند ہو گیا ہو اس کے لئے تین ماہ ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: "والمطلقات يتربصن بأنفسهن ثلاثة قروء" (سورۃ بقرہ ۲۲۸)، اور: "وأولات الأحمال أجلهن أن يرضعن حملهن" (سورۃ طلاق ۴)، اور: "واللّٰهي يسنن من المحيض من نسائكم" "فعدتهن ثلاثة أشهر" (سورۃ طلاق ۴)۔

(۲) اس لئے کہ ان دونوں کے درمیان حرمت کا رشتہ نہیں ہے جو آپس میں نکاح کے لئے مانع ہو۔

مطلقة عورت سے نکاح

زید نے ایک مطلقہ عورت سے ناجائز تعلق کر کے تقریباً آٹھ سال سے تین بچے پیدا کئے، جب سے یہ تعلق پیدا ہوا اس وقت سے اب تک خورش و پوشش کا کل اخراجات زید ہی کر رہا ہے، ان کے اور ان کے بچوں کے کھانے پینے کا زید کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے، اب زید اس سے چھٹکارا چاہتے ہیں، شرعاً زید کو اس سے نجات پانے کے لئے کیا کرنا ہوگا؟

الجواب وبالله التوفیق

زید اب تک توبہ ترین گناہ کرتا ہی رہا، اب دوسرا اس سے بھی زیادہ بڑا گناہ کرنا چاہتا ہے، یعنی اس عورت کو اور ان بچوں کو جسے زید نے پیدا کیا ہے، بے سہارا اور محتاج چھوڑ دینا چاہتا ہے، یہ دونوں باتیں بہت بُری ہیں، زید کو چاہئے کہ فوراً اس عورت سے نکاح کر لے اور سب کی کفالت کرتا رہے اور اپنے پچھلے گناہوں سے توبہ کرے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب المہر

مہر روپے کی شکل میں رکھنا بہتر ہے یا سونے چاندی کی شکل میں

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں:

مہر، سکہ رائج الوقت یعنی روپے میں رکھنا بہتر اور مناسب ہے، یا سونے، چاندی یا زیورات کی شکل میں زیادہ بہتر اور مناسب ہے، فوری ادا کرنا اچھا ہے، یا تاخیر سے؟ وضاحت فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

الجواب وبالله التوفیق

بہتر یہی ہے کہ سونے یا چاندی میں مہر مقرر کیا جائے، اس میں لڑکی کا فائدہ اور اس کے حق کی حفاظت ہے (۱)۔

مہر نقد ادا کر دینا ہی بہتر ہے، اگر نکاح کے وقت نہ دے تو رخصتی کے بعد جلد سے جلد ادا کر کے بری الذمہ ہو جائے (۲)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مہر کی ادائیگی کا وقت

بیوی کا مہر کس وقت دینا چاہئے، کاغذات صحیح طور پر لکھنا چاہئے یا غلط لکھا گیا تو اسے مان لینا چاہئے؟

الجواب وبالله التوفیق

مہر شریعت کا مقررہ کردہ ایک فریضہ ہے، اس لئے مہر کی ادائیگی نکاح کے بعد بیوی سے

(۱) سونے چاندی میں مہر کی ادائیگی اس لئے بہتر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عام طور پر درہم و دینار کے ذریعہ مہر مقرر فرمایا، درہم سونے کا ہوا کرتا ہے اور دینار چاندی کا، اور اس میں عورت کے حق کی حفاظت اس لئے ہے کہ سونے چاندی کی قیمت میں استحکام ہوتا ہے اور وقت کے گزرنے کے ساتھ اس کی قدر بھی بڑھتی جاتی ہے اور کاغذی نوٹ اور سکوں کی قیمت میں استحکام نہیں ہوتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ اس کی قدر بھی گھٹتی جاتی ہے۔

(۲) مہر چونکہ دوسرے دیون کی طرح ایک دین ہے اور دین کے سلسلہ میں اصول یہی ہے کہ اسے جلد سے جلد ادا کر دینا اور اس کی ذمہ داری سے برأت حاصل کر لینا چاہیے۔

ملنے سے پہلے ہونی چاہئے، البتہ بعد میں بھی ادا کیا جائے تو ادا ہو جائے گا، مہر طے کرتے وقت جتنا مہر طے ہوا تھا اور جس طرح ہوا تھا اسی طرح ادا کرنا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَأَتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً، فَإِنْ طِبَّنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِينًا مَرِيئًا" (۱)۔
 "فَأَنْكِحُوهُنَّ بِأَدْنِ أَهْلِهِنَّ وَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ" (۲)۔
 "فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً" (۳)۔

فریقین کو اپنے معاہدے پر قائم رہنا لازم ہے، اور اس سے انحراف شرعاً حرام ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا" (۴) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

بیوی کو دیا ہوا مال اس کی ملکیت ہے

میں نے لڑکی کو پونے چار تولے سونے کے زیور اور دس تولے چاندی چڑھائی تھی، لیکن جب بہو اور میری لڑکیوں میں ان بن ہو گئی تو میں دوسری جگہ جہاں کہ میری زمین ہے اس پر لڑکے اور بہو کے لئے کمرہ بنانا شروع کر دیا۔ جب پیسے کی کمی پڑی تو میں نے لڑکی کو چڑھائے زیور بیچ کر مکان مکمل کرایا اور ان دونوں کو علاحدہ کر دیا، مجھے بتایا جائے کہ کیا ہم نے جو زیور لڑکی شیا کو چڑھائے تھے اس پر طلاق ہو جانے کے بعد شیا تبسم (بہو) کا حق ہے، یا وہ زیور ہمارے ہیں؟

الجواب وبالله التوفیق

جو زیورات لڑکے والوں کی طرف سے بہو کو دیئے گئے اس کی ملکیت ہیں، وہ زیورات یا ان کی مالیت بہو کو ادا کرنا ضروری ہے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

- (۱) سورۃ نساء ۴ (اور تم بیویوں کو ان کے مہر خوش دلی کے ساتھ دیدیا کرو، لیکن اگر وہ خوشدلی سے تمہارے لئے اس میں کا کوئی جز چھوڑ دیں تو تم اسے مزہ دار اور خوشگوار سمجھ کر کھاؤ)۔
- (۲) سورۃ نساء ۲۵ (سوان کے مالکوں کی اجازت سے ان سے نکاح کر لیا کر اور ان کے مہر ان کو دیدیا کرو مقرر کے موافق)۔
- (۳) سورۃ نساء ۲۴ (پھر جس طریقہ سے تم نے ان عورتوں سے لذت لی ہے، سو انہیں ان کے مقرر شدہ مہر دیدو)۔
- (۴) سورۃ اسراء ۳۴ (اور عہد کی پابندی رکھو، بیشک عہد کی باز پرس ہوگی)۔

باب النسب

ولد الزنا ثابت النسب ہے یا نہیں؟

زنا کے نتیجہ میں جو اولاد پیدا ہوگی اس کا نسب کس سے ثابت ہوگا، نیز اس کی کفالت کس کے ذمہ ہوگی؟

الجواب وبالله التوفیق

بے شعوری یا نقص عقل ان معاملات میں عذر نہیں، اگر وہ لڑکی شادی شدہ ہے تو اس کا بچہ اس کے شوہر کی طرف منسوب ہوگا "الولد للفراش وللعاهر الحجر" (۱)۔
 اور اگر غیر شادی شدہ ہے تو بچہ ماں کی طرف منسوب ہوگا اور ماں پر اس کی پرورش واجب ہوگی اور اگر کوئی صورت نہیں تو جماعت مسلمین پر اس بچہ کی کفالت ضروری ہوگی، ارشاد رسول ﷺ ہے: "أَنَا وَلِي مَنْ لَا وَلِيَّ لَهُ" (۲)۔

(۱) سنن أبی داؤد کتاب الطلاق ۲/۵۵ طبع استنبول۔

(۲) مسند احمد ۳/۱۳۳ طبع استنبول۔

باب الولایۃ

ماں بچوں کی ولی ہو سکتی ہے

ہمارے والد بزرگوار ویسٹ بنگال گورنمنٹ کے کسی پوسٹ پر کام کرتے تھے، ان کے کچھ روپے گورنمنٹ کے ذمہ ہیں اور صحیح معنوں میں وہ روپیہ ہم لوگوں کو ملنا چاہئے، افسروں کا کہنا ہے کہ اسلامی قاعدہ سے یہ روپیہ تمہاری ماں کو دیا جاسکتا ہے، یا نہیں، ہم دو بھائی نابالغ اور ایک بہن نابالغ ہیں، فی الحال ہم اپنی ماں کی گود میں پرورش پا رہے ہیں، اس وقت تو میری ماں گویا باپ کا حق ادا کر رہی ہیں۔ امید ہے کہ آپ حضور نیک مشورہ سے ضرور ہدایت کریں گے۔

الجواب وبالله التوفیق

جب آپ لوگوں کی والدہ ہی آپ لوگوں کی سرپرستی اور تولیت کے فرائض انجام دے رہی ہیں اور ظاہر ہے کہ ماں جیسی شفقت کسی اور سے متوقع نہیں، ایسی صورت میں ماں بچوں کی ولی ہو کر ان کے مال پر قبضہ کر سکتی ہے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتاب الطلاق

طلاق دینے کا شرعی طریقہ

شریعت میں طلاق کس طرح دی جاتی ہے اور کس طرح دینا چاہئے؟

الجواب وبالله التوفیق

طلاق کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ جب عورت کی ماہواری ختم ہو جائے اور وہ پاک ہو جائے اور شوہر نے اس کے ساتھ صحبت نہیں کی ہو تو اس حالت میں اگر مجبوری ہو یعنی نباہ نہیں ہو پا رہا ہو تو ایک بار طلاق دی جائے اور بس۔ اس کے بعد اگر نباہ کی صورت نکل آئے تو سبحان اللہ، عدت کے اندر اندر لوٹا لے اور نباہ کی صورت نہیں تو خاموش رہے، عدت گزارنے کے بعد عورت بائن ہو جائے گی، یہ سب سے بہتر صورت ہے، پھر اگر ضرورت ہو تو دوسرے اور تیسرے مہینہ میں پاکی کی حالت میں ایک ایک طلاق دی جاسکتی ہے، تین طلاقیں بیک وقت دینا گناہ کی بات ہے، البتہ دینے سے تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔

چنانچہ ہدایہ میں ہے: "(فالأحسن أن يطلق الرجل امرأته تطليقة واحدة في طهر لم يجمعها فيه ويتركها حتى تنقضي عدتها) لأن الصحابة رضي الله عنهم كانوا يستحبون أن لا يزدوا في الطلاق على واحدة حتى تنقضي العدة، فإن هذا أفضل عندهم من أن يطلقها الرجل ثلاثاً عند كل طهر واحدة ولأنه أبعد من الندامة وأقل ضرراً بالمرأة... حيث أبقى لنفسه مكنة للتدارك حيث يمكنه التزوج بها في العدة أو بعدها دون تخلل زوج آخر" (۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

طلاق کے لئے کنائی الفاظ کے استعمال میں نیت کا اعتبار

طلاق کے بارے میں سوال کیا گیا کہ شوہر نے بیوی کو مندرجہ ذیل خط لکھا، اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ اس کی نیت طلاق دینے کی نہیں تھی، تو کیا اس سے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

(خط کا ایک حصہ) تم اپنے کو کیا سمجھتی ہو، گھر میں آدمی کی ضرورت ہے، آدمی بیمار ہے، تم اپنے بھائی سے ملاقات کرنے یا رخصت کرنے میں اگر تین دن لگاؤ گی تو ہم کو ایسے آدمی کو گھر میں رکھنے کی ضرورت نہیں ہے، تم آزاد ہو جہاں چاہو، چلی جاؤ، تمہارا کوئی مالک نہیں ہے، تم کو ہمارے گھر میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے، تم کو ایک بار نہیں ہزار بار تاکید کر دیا، اب صرف آخری فیصلہ باقی رہ گیا ہے اگر تم باز نہیں آئی تو وہ بھی وقت آجائے گا، اگر تم وہی چاہتی ہو تو ہم بھی تیار ہیں، اگر تم کو ہمارے حکم کے مطابق چلنا ہے تو انسان کے بچہ کی طرح رہو گی، ورنہ اپنا راستہ دیکھو، اگر گھر میں لڑائی جھگڑا ہوا، یا ہم کو گھر کے خط سے پتہ چلا کہ کچھ بھی ڈرامہ ہوا ہے، تو تم جانو اور تمہارا کام جانے۔

الجواب وبالله التوفیق

سوال میں مذکور شوہر کے خط کے ابتدائی حصہ میں جو الفاظ مشروط استعمال کئے گئے ہیں، وہ کنایات میں سے ہیں جو عام طور پر محتاج نیت ہوتے ہیں، یا کبھی دلالت حال سے ہی اس کا مفہوم متعین ہوتا ہے۔

دلالت حال میں دلالت قولی اور دلالت عملی دونوں شامل ہیں، اس میں غضب اور مذاکرہ بھی داخل ہوتا ہے، خط میں ناراضی کا اظہار ضرور ہے، لیکن کاتب نے خط غصہ کی حالت میں لکھا تھا کہنا مشکل ہے، مذاکرہ موجود نہیں ہے، مذاکرہ میں مطالبہ طلاق یا تقدیم طلاق ضروری ہے جو یہاں موجود نہیں ہے اور خارجی احوال سے پہلے حکم کی تعیین میں کسی تحریر یا قول کے سیاق و سباق کی دلالت

زیادہ اہم اور واضح حیثیت رکھتی ہے، خط مذکور میں شوہر کے یہ جملے "تم کو ایک بار نہیں ہزار بار تاکید کر دیا، اب صرف آخری فیصلہ باقی رہ گیا ہے، اگر تم باز نہیں آئی تو وہ وقت بھی آجائے گا، اگر تم وہی چاہتی ہو تو ہم بھی تیار ہیں..... اگر تم کو ہمارے حکم کے مطابق چلنا ہے تو انسان کے بچہ کی طرح رہو گی"، وغیرہ صراحتہ دلالت کرتے ہیں کہ کاتب کے پہلے جملوں سے نیت، طلاق کی نہیں، بلکہ آئندہ حالت نہیں سدھارنے کی صورت میں طلاق کی دھمکی دینا مقصود ہے، ایسی صورت میں شوہر کا یہ کہنا کہ اس کی نیت طلاق کی نہیں تھی، ظاہر حال اس کی تائید و تصدیق کرتا ہے، اور معلوم ہے کہ خلاف ظاہر کا اثبات محتاج بینہ ہے اور نیت ظاہر حال کے لئے مثبت ہے۔

فالكنايات (لا تطلق بها) قضاء (إلا بنية أو دلالة الحال) در مختار، (قوله: قضاء) قيد به لأنه لا يقع ديانة بدون النية ولو وجدت دلالة الحال فوقعه بواحد من النية أو دلالة الحال، إنما هو في القضاء فقط كما هو صريح، البحر وغيره۔ (قوله: أو دلالة الحال) المراد بها الحالة الظاهرة المفيدة لمقصوده ومنها تقدم ذكر الطلاق، بحر عن المحيط..... فتفسر المذكرة بسؤال الطلاق أو تقديم الإيقاع كما في اعتدى ثلاثاً (۱)۔

پس مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں سوال میں مذکور خط کے جملوں سے طلاق اسی صورت میں واقع ہوگی جب کہ کاتب تحریر نے طلاق کی نیت بھی کی ہو، اگر شوہر یہ کہتا ہے کہ اس نے یہ جملے لکھتے وقت طلاق کی نیت نہیں کی تھی تو اس سے حلف لے لیا جائے، اگر وہ حلفاً طلاق کی نیت سے انکار کر دے تو اس کی بات مان لی جائے گی اور اس کی بیوی حسب سابق اس کی بیوی رہے گی، والقول له بيمينه في عدم النية (۲)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کیا بحالت غضب "جواب دیا" سے طلاق واقع ہو جائے گی؟

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسائل ذیل کے سلسلہ میں:

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ۳/۲۹۶، ۲۹۷ طبع پاکستان۔

(۲) الدر المختار علی رد المحتار ۳/۳۰۱، ۳۰۲ طبع پاکستان۔

زید نے اپنی بیوی ہندہ کو آپسی حجت و تکرار کے دوران سب و شتم نیز معمولی زد و کوب کے بعد یوں کہا کہ جاؤ میں نے تم کو جواب دیا، جواب دیا، جواب دیا، یعنی تین بار۔ زید کا کہنا ہے کہ میں نے بحالت غضب یہ بات کہی ہے، حالانکہ علاحدگی اور جدائی کی کوئی نیت نہیں تھی اور نہ ہے اور یہ واقعہ کل بروز پیر کا ہے۔ جب کہ یوپی اور بہار میں خاص طور سے طلاق کے ساتھ لفظ جواب عطف تفسیر کے طور پر استعمال کرنے کا عام رواج ہے، (کہا جاتا ہے فلائی کا جواب ہو گیا، یعنی طلاق ہو گئی)۔

الغرض زید اپنی جملہ حرکتوں پر نادم ہے اور دوبارہ ہندہ کو اپنی زوجیت میں لینا چاہتا ہے، اس کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

الجواب وبالله التوفیق

لفظ "جواب دیا" ان الفاظ کنائی میں سے ہے جس کا استعمال طلاق میں متعارف ہے، اس لئے صورت مذکورہ میں نیت کے استفسار کی حاجت نہیں ہے اور زید کی بیوی پر طلاق بائن واقع ہو چکی ہے اور چونکہ "جواب دیا" صریح نہیں، الفاظ کنائی میں سے ہے، اس لئے فقہاء کے بیان کردہ قاعدہ: "البائن لا يلحق البائن" کے مطابق زید کی بیوی پر صرف ایک طلاق بائن واقع ہوئی ہے، زید اور اس کی بیوی دونوں راضی ہیں تو دوبارہ نکاح کر کے ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔

"والحاصل أن المعتبر في انصراف هذه الألفاظ عربية أو فارسية إلى معنى بلا نية التعارف فيه، فإن لم يتعارف سئل عن نيته وفيما ينصرف بلا نية لو قال أردت غيره يصدق ديانة لا قضاء الخ، ما في الفتح، وتبعه في البحر، قلت والمتعارف في ديارنا إرادة الطلاق بقولهم علي الحرام لا أفعل كذا دون غيره من الألفاظ المذكورة" (۱)، فقط، والله تعالى أعلم۔

(۱) رد المحتار، باب الإيلاء، ۳۵۷، ۳۵۸، طبع پاکستان۔

"البائن لا يلحق البائن" سے مراد؟

در مختار کی عبارت "البائن لا يلحق البائن" کی مکمل وضاحت فرمائیں اور یہ کہنے سے کہ میں نے تجھے تین طلاق بائن دے دی، کتنی طلاقیں واقع ہوں گی اور کون سی واقع ہوں گی؟

الجواب وبالله التوفیق

اگر پہلے طلاق بائن واقع ہو چکی ہے خواہ لفظ صریح یا لفظ کنائی سے تو دوبارہ طلاق بائن لفظ کنائی سے واقع نہیں ہوگی، یہ ہے مطلب فقہاء کے قول "البائن لا يلحق البائن" کا، (۱) لایہ کہ صراحت کر دے کہ میں دوسری طلاق بائن واقع کر رہا ہوں تو لفظ کنائیہ سے دوسری طلاق بائن بھی واقع ہو جائے گی، اور اگر کسی نے کہا "میں نے تجھے تین طلاق دی" تو اس سے تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی اور عورت حرام ہو جائے گی، کحرمۃ غلیظۃ۔

(لا) يلحق البائن (البائن) إذا أمكن جعله إخباراً عن الأول كانت بائن بائن أو أبستك بأخرى (قوله لا يلحق البائن البائن) المراد بالبائن الذي لا يلحق هو ما كان بلفظ الكناية لأنه هو الذي ليس ظاهراً في إنشاء الطلاق كذا في الفتح وقيد بقوله الذي لا يلحق إشارة إلى أن البائن الموقع أولاً أعم من كونه بلفظ الكناية أو بلفظ الصريح المفيد للبينة كالطلاق على مال (۱)، فقط، والله تعالى أعلم۔

طلاق کی قسم کا کیا حکم ہے؟

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں:

مدعی بینہ پیش کرنے سے قاصر رہے تو کیا مدعا علیہ سے طلاق کی قسم لی جاسکتی ہے؟ طلاق کی قسم کا کیا حکم ہے؟ خصوصاً طلاق "مغلطہ" یا "کلمہ" کی قسم کا مطالبہ کیسا

(۱) الدر المختار مع رد المحتار باب الکنايات ۳۰۸، ۳۰۹، طبع پاکستان۔

ہے؟ نیز قسم کے لئے مدعی کا مطالبہ ضروری ہے یا قاضی از خود بغیر مطالبہ کے قسم لے گا؟ کتب قضاء و فتاویٰ کے حوالے بھی تحریر فرمائیں تو مہربانی ہوگی۔

الجواب وبالله التوفیق

کسی بھی خصومت میں مدعی کے پاس بینہ موجود نہیں ہونے کی صورت میں مدعا علیہ سے حلف لیا جاتا ہے، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا ہے: ”البینۃ علی المدعی والیمین علی المدعی علیہ“ (۱) یہ حلف اللہ کے نام کا ہونا چاہئے۔ اور بس، تغلیظ کے لئے صفات الہی کا اضافہ کیا جاسکتا ہے، طلاق یا عتاق کی قسم لینا حرام اور ممنوع ہے، لہذا اگرچہ مدعی اصرار کرے طلاق کی قسم نہیں لی جاسکتی۔

در مختار میں ہے: ”(والیمین باللہ تعالیٰ) لحديث ”من كان حالفاً فليحلف بالله تعالى أو ليذر (۲) (لا بطلاق وعتاق) وإن ألح الخصم، وعليه الفتوى، تاتارخانية، ”لأن التحليف بهما حرام“ خانیہ (۳)۔

اگر مدعا علیہ پر طلاق کی قسم پیش کی جائے اور وہ انکار کر دے تو اس کا یہ انکار ”نکول عن الحلف“ قرار نہیں پائے گا اور نہ اس انکار سے مدعی کا دعویٰ ثابت تسلیم کیا جائے گا، جیسا کہ حلف باللہ کی صورت میں نکول عن الحلف، اقرار دعویٰ کے حکم میں ہو کر موجب ثبوت دعویٰ ہوتا ہے۔ اس کے خلاف جو قول بعض کتب میں مذکور ہے، اسے صاحب بحر نے ضعیف قرار دیا ہے، قاضی خاں نے اس کی صراحت کی ہے کہ ”اگر مدعی طلاق یا عتاق کے حلف کا مطالبہ کرے تو قاضی اس کے اس مطالبہ کو قبول نہیں کرے گا، اس لئے کہ طلاق وعتاق کی قسم لینا حرام ہے“ (۴) اور تاتارخانیہ نے اس قول کے

(۱) سنن الترمذی، کتاب الأحکام ۶۲۶/۳، حدیث: ۱۳۴۱، صحیح البخاری، کتاب الزہن۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب مناقب الأنصار ۲۳۳/۳، طبع استنبول۔

(۳) الدر المختار علی رد المحتار، کتاب الدعوی ۳۰۳/۸، طبع بیروت۔

(۴) وفي الخانية: ”وإن أراد المدعی تحلیفه بالطلاق والعتاق في ظاهر الرواية لا بجيبه القاضي إلى ذلك لأن التحليف بالطلاق والعتاق حرام“ (البحر الرائق ۲۱۳/۷، طبع بیروت)۔

مفتی یہ ہونے کی تصریح کی ہے: ”والفتوى على عدم التحليف بالطلاق والعتاق“ (۱)۔

اصل یہ ہے کہ مدعا علیہ سے حلف مدعی کے مطالبہ کے بعد ہی لیا جائے، بعض صورتوں میں امام ابو یوسف سے اس کے خلاف منقول ہے (۲)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

طلاق کا حکم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں:

میمونہ خاتون کو اس کے شوہر سلیمان نے بارہ بجے رات میں زد و کوب کر کے کہا کہ میں نے تجھ کو طلاق دے دی، طلاق دے دی، متعدد بار، اس لفظ کو دہرایا اور کہا کہ تو یہاں سے نکل جا، شور و غل سن کر میمونہ کی چچی خوش دامن آئیں اور سلیمان کو ڈانٹ کر بولی کہ تم نے کیوں طلاق دی اور میمونہ کو اپنے گھر لے گئیں اور سلیمان کا چچا اور اس کی بہن نے بھی طلاق دیتے ہوئے سنی، یہ بیان میمونہ کا ہے۔

لیکن میمونہ کے شوہر سلیمان کہتے ہیں کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی ہے اور طلاق دینے سے انکار کیا اور تین گواہوں میں سے صرف میمونہ کی چچی خوش دامن نے جو سلیمان کی چچی ہوتی ہیں طلاق کی گواہی دی کہ اس نے سلیمان سے سنا ہے، لہذا دریافت یہ ہے کہ یہ طلاق از روئے شریعت ہوئی یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق

سوال مذکور سے پتہ چلتا ہے کہ شوہر نے ”میں نے تجھ کو طلاق دے دی“ کا جملہ دوبار سے

زیادہ کہا ہے، ایسی صورت میں اس کی بیوی پر تین طلاق مغلظہ واقع ہو گئی، بدون حلالہ وہ عورت شوہر کے لئے حلال نہیں، قرآن کریم میں ہے: ”فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ

(۱) البحر الرائق ۲۱۳/۷، طبع بیروت، الدر المختار علی رد المحتار ۳۰۳/۸، طبع بیروت۔

(۲) معین الأحکام ۶۸۔

زَوْجًا غَيْرَهُ" (۱)۔

سوال سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شوہر کو اب طلاق سے انکار ہے، نیز گواہوں کے بیانات بھی مختلف ہیں، ایسی صورت میں ضروری ہے کہ سلیمان، اس کی بیوی، سلیمان کا چچا، اس کی بہن اور میمونہ کی چچی خوش دامن یہ سب لوگ قاضی شریعت دارالقضاء پھلواری شریف کے پاس حاضر ہوں، شہادتیں لے کر، پھر حسب ضابطہ شرع سلیمان سے حلف لے کر جو فیصلہ قاضی شریعت کر دیں، اس پر عمل کریں، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

عدہ ذکر کئے بغیر دی ہوئی طلاق کا حکم

کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین مسئلہ ذیل میں:

زید نے اپنی منکوحہ فاطمہ کو طلاق دی، مگر اس نے عدہ طلاق بیان نہیں کیا، بلکہ صرف یہ کہا کہ "میں نے تم کو طلاق دی" فاطمہ دوسرے روز اپنے میکہ چلی آئی، اس واقعہ کو تقریباً چھ ماہ کا عرصہ ہو گیا، اب زید اپنے کئے پر نادم ہے اور وہ فاطمہ کو اپنی زوجیت میں رکھنا چاہتا ہے، صورت مذکورہ میں زید کا ایسا کرنا درست ہوگا؟ کیا تجدید نکاح کے ذریعہ فاطمہ زید کی زوجیت میں دوبارہ جاسکتی ہے؟ براہ کرم جواب صواب سے نواز کر عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب وبالله التوفیق

صورت مذکورہ میں اگر زید نے صرف یہ جملہ "میں نے تم کو طلاق دی" کہا ہے اور عدہ طلاق بیان نہیں کیا تو اس کی بیوی فاطمہ پر ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی، "والطلاق يقع بعدد قرون به لا به نفسه عند ذكر العدد وعند عدمه الوقوع بالصيغة" (۲)۔

زید کے لئے جائز ہے کہ اپنی بیوی کو عدت کے اندر اندر لوٹالے، عدت ختم ہو جانے کے

(۱) سورہ بقرہ ۲۳۰۔

(۲) الدر المختار مع رد المحتار ۳/۵۱۳، ۵۱۴ طبع بیروت۔

بعد بغیر دوبارہ نکاح کے رکھنا درست نہیں، لوٹانے کا مستحب طریقہ یہ ہے کہ شوہر دو آدمیوں کو گواہ بنا کر یہ کہے کہ میں نے اپنی بیوی کو لوٹا لیا (۱)۔

عام عورتوں کی عادت یہ ہے کہ عدت "تین حیض" تین مہینے میں گذر جاتی ہے، اگر اس عورت کی بھی عدت گذر چکی ہے تو دوبارہ نکاح کرنا ضروری ہوگا، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

حالت حمل میں دی ہوئی طلاق کا حکم

گزارش ہے کہ فدوی مدرسہ اصلاح المسلمین پتھری مسجد پٹنہ میں باورچی کا کام کرتے تھے، میری بیوی کی حالت یہ تھی کہ وہ اپنے جسم کی حفاظت نہیں کر سکتی تھی اور ماری ماری پھرتی تھی، کلام صاحب نے ہم کو بلا کر یہ سب بات کہا تو ہم شرمندہ ہو گئے، ہم نے کلام میاں سے کہا: آپ کو ایسی حرکت ہم سے نہیں کہنا چاہئے تھا، اس پر اس نے ڈانٹ کر کہا کہ ہم کیا کریں تم اس کو مار کر پھینک دو، ہم نے کہا کہ ہم نے بہت اصلاح کیا، آئندہ اس کو ہم الگ کر دیں گے۔ ایک روز ہم نے اپنا سامان دوسری جگہ لے جانا چاہا اور ہم کہتے ہیں کہ تم اس کو طلاق ابھی دے دو، کلام صاحب کی بیوی اور ان کی خوش دامن اور خود انہوں نے ہم کو اپنے گھر میں بلایا اور زبردستی یہ کہہ کر کہ ہم اس کی دوسری شادی کر دیں گے، تم اس وقت ہم تینوں کے سامنے طلاق دے دو، مجبوراً ہم کو طلاق دے دینا پڑا، اور سات آٹھ ماہ کا حمل ہے، ولادت عنقریب ہے، ایسی حالت میں جب کہ ہم نے تین طلاق دے دیا اور یہ حاملہ بھی ہے، یہ میری زوجیت میں رہی کہ نہیں؟ اس کو حضور بتادیں۔

(۱) قرآن کریم میں ہے: "وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ" (سورہ طلاق ۲) اور رد المحتار میں ہے: "(والمندوب الإشهاد) بعدلین... وأن الرجعة على ضربين: سني، ويدعى، فالسني أن يراجعها بالقول ويشهد على رجعتها ويعلمها" (الدر المختار مع رد المحتار ۵/۲۸)۔

الجواب وبالله التوفيق

صورت مذکورہ میں اگر واقعی آپ نے اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی ہے تو آپ کی بیوی پر تین طلاق مغلظہ واقع ہوگئی اور وہ عورت آپ کے لئے حرام ہو چکی ہے۔ بغیر حلالہ کے دوبارہ اس سے نکاح درست نہیں (۱) فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

حالت نشہ میں تحریری طلاق کا حکم

جنید عالم نے اپنی اہلیہ کو خانگی اختلافات کی بنیاد پر میکہ پہنچا دیا اور خود کلکتہ روانہ ہو گئے، وہاں انہوں نے چند دوستوں کی ضد پر تازی پی لی، نشہ کی کیفیت سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ ایں و آں سے یکسر بے نیاز ہو گئے، بعد ازاں ان کے دوستوں نے ان کو قیام گاہ پر پہنچا دیا۔ نشہ کی اس کیفیت میں ذہن سے خانگی زندگی محو ہونے کی بجائے ذہن کے پردے پر نمایاں ہونے لگی جس کی تاب وہ نہ لاسکے اور اسی آشفٹہ سری اور ذہنی انتشار کے عالم میں انہوں نے ایک خط تحریر کیا جس میں تین مرتبہ یہ جملہ لکھا ”جنید عالم نے سہیلہ خاتون کو طلاق دیا“ (سہیلہ خاتون جو جنید عالم کی اہلیہ ہیں) اس جملہ سے پہلے یا بعد، کیا کچھ لکھا انہیں قطعاً یاد نہیں۔ یہ خط انہوں نے اپنے ایک دوست کی مدد سے سپرد ڈاک کیا۔ خط موصول ہونے پر ان کی اہلیہ نے بے ساختہ کہا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، وہ ہرگز نہیں کر سکتے، یقیناً وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں، ان کی اہلیہ نے اپنے والد پر زور دیا کہ مجھے میرے سسرال پہنچا دو، لیکن اس کے والد صاحب اس کے لئے

(۱) ”فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ“ (سورہ بقرہ ۲۳۰)۔

نیز حالت حمل میں طلاق دینے سے بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے اور اس کی عدت وضع حمل ہے: ”(و) فسی حق (الحامل) مطلقاً ولو أمة أو كتابية أو من زنا بان تزوج حبلی من زنا ودخل بها ثم مات أو طلقها تعند بالوضع“ (الدر المختار علی رد المحتار ۵/ ۱۸۹، ۱۹۰ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت)

آمادہ نہ ہوئے۔

یہ خط آج سے تقریباً تین ماہ قبل اپنے خسر صاحب کے نام انہوں نے روانہ کیا تھا جب کہ ان کی اہلیہ تین ماہ کی حاملہ تھیں، معاملے کی نوعیت کے پیش نظر از روئے شریعت طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفيق

صورت مذکورہ میں اگر جنید عالم نے اپنے خسر کو یہ جملہ ”جنید عالم نے سہیلہ خاتون کو طلاق دیا“ تین مرتبہ لکھ کر بذریعہ ڈاک بھیجا (خواہ نشہ ہی کی حالت میں لکھا ہو) تو اس کی بیوی پر تین طلاق مغلظہ واقع ہوگئی اور وہ عورت اب اپنے شوہر کے لئے بالکل حرام ہو چکی (۱)۔ واضح ہو کہ طلاق نشہ کی حالت میں بھی واقع ہو جاتی ہے جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، البحر الرائق میں ہے: ”وفی الخانیة من کتاب الخلع سائر تصرفات السكران جائزة الخ“ (۲)۔

حاملہ عورت کو طلاق دینے سے بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کیا طلاق سکران کا وقوع اجماعی ہے؟

محترم المقام حضرت اقدس قاضی صاحب صدر مسلم پرسنل لا بورڈ!

ابھی حال ہی میں ایک نومولود رسالہ ”ترجمان دیوبند“ میں فقہی سمینار کے عنوان پر ایک طویل مضمون خود راقم کی اور بہت سے احباب کی نظروں سے گذرا۔ ایک سمینار کے موقع پر ”نشہ آور کی طلاق“ کی بحث میں حضرات مفتیان کرام کے متضاد بیانات بھی باعث تشویش ہیں، راقم چونکہ عنادل قاسمیہ سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے بلا جھجک حضرت والا سے ہی رابطہ قائم کر کے اجماعی مسئلہ کا خواہاں ہے۔

راقم اب تک تو یہی پڑھتا، دیکھتا و سنتا اور سنا تا چلا آیا ہے کہ ”نشہ آور کی طلاق“

(۱) ”فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ“ (سورہ بقرہ ۲۳۰)۔

(۲) البحر الرائق ۳/ ۲۶۶۔

کے وقوع میں کوئی شبہ نہیں اور اس پر قدامت و متاخرین فقہاء امت کا اجماع ہے، لیکن حضرت والا اور چوبیس مفتیان کرام کی رائے دیکھ، پڑھ کر کہ ”طلاق واقع نہیں ہوگی“ خلاف اجماع کا ارتکاب کرنا لازم آرہا ہے، جس کی وجہ سے راقم کو سخت تشویش ہے۔ اس لئے حضرت والا کی نظر دقیق واقعی اگر صحت پر قائم ہے تو دلیل سے آگاہ فرمائیں۔ صحیح کیا ہے، مدلل، مبرہن اور مستح فرمائیں، تاکہ باہمی چہ میگوئیاں ختم ہوں، ”بحث و نظر“ کا رسالہ بھی عنوان ذیل سے حکم اجراء فرما کر ممنون و مشکور فرمائیں۔

الجواب وبالله التوفیق

محترمی!

سلام مسنون

آپ کا خط پا کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے براہ راست مجھ سے پوچھ لیا، محض کہنے سننے پر رائے قائم نہیں کی۔

آپ کی تحریر کا حاصل یہ ہے کہ ”طلاق سکران“ کا وقوع اجماعی قول ہے، اس کے خلاف کوئی رائے دینا خرق اجماع ہے، اصل سوال یہ ہے کہ یہ مسئلہ ”مجمع علیہ“ ہے، یا ”مجتہد فیہ“؟ اگر تمام فقہاء کے اقوال کا احصاء کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ”مسئلہ وقوع طلاق سکران“ کے مجتہد فیہ ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، خود ائمہ احناف میں امام طحاوی، امام کرخی اور ابن مسلمہ جیسے جلیل القدر اصحاب کا قول بھی یہی ہے کہ ”سکران کی طلاق واقع نہ ہوگی“۔

دیگر ائمہ کے یہاں بھی اس طرح کے اقوال ملتے ہیں، لہذا مسئلہ کے اجماعی ہونے کا دعویٰ اور عدم وقوع طلاق سکران کے قول کو خرق اجماع قرار دینا خطا، فاحش اور قصور مطالعہ کی دلیل ہے۔

سمینار میں جو کچھ فیصلہ کیا گیا وہاں صرف یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ طلاق کی کثرت اور اس کے نتیجہ میں خاندان کی بربادی، بیوی اور بچوں کا مبتلائے مصائب ہونا عظیم فتنہ ہے۔ علی العموم طلاق دینے والا مرد دوسری شادی کر کے آرام سے رہتا ہے، جو کچھ مصیبت جھیلنی پڑتی ہے وہ مطلقہ عورت

کو۔ پھر نشہ کا بھی رواج عام ہے، جس میں آدمی ہوش و حواس کھو کر اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے، پس امام ابو حنیفہ یا دیگر ائمہ جو وقوع طلاق سکران کے قائل ہیں، ان کے قول اور ان کی دلیلوں سے اختلاف کئے بغیر آج کے زمانہ میں معروف قول سے عدول کر کے، کیا اس قول کو اختیار کیا جاسکتا ہے، جو سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے اور عمر بن عبدالعزیز، قاسم، طاؤس، ربیعہ، یحییٰ انصاری، امام لیث، غنبری، اسحاق، ابو ثور اور امام مزنی کا قول ہے۔

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول بروایت صحیحہ ثابت ہے (۱)؛ فقال أحمد حدیث عثمان أرفع شيء فيه (۲)۔

پس وقوع طلاق کا قول جو اکثر ائمہ اور تابعین یعنی سعید بن المسیب، عطاء، مجاہد، سیرین، شعبی، نخعی، ثوری، اوزاعی اور امام شافعی (ایک قول میں) وغیرہ کا ہے، کیا اس قول کو چھوڑ کر معاشرہ کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لئے، دوسرے قول کو اختیار کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں حضرات اصحاب افتاء کو ان چند باتوں کو دیکھنا ہے کہ مسئلہ ”مجتہد فیہ“ ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ واقعی معاشرہ ایسے فتنہ میں مبتلا ہے یا نہیں؟ جس سے بچانے کے لئے مذہب کے معروف قول سے غیر معروف کی طرف عدول کرنا جائز ہو۔ آراء کا اختلاف اسی تجزیہ میں ہوا ہے، کیا واقعی صورت حال ایسی سنگین ہے کہ مذہب کے قول معروف کو چھوڑ کر ہم خود مذہب حنفیہ کے دوسرے قول کی طرف رجوع کریں، آپ صرف درمختار کا مطالعہ کریں، جہاں لکھا ہے: ”ولم يوقع الشافعي طلاق السكران واختاره الطحاوي والكرخي وكذا محمد بن سلمة وهو قول زفر“ (۳)۔ اور تارخانیہ میں ”تفرید“ سے منقول ہے: ”والفتوى عليه“ (۴)۔ اگرچہ تارخانیہ کی

(۱) حدثنا سعيد قال: حدثنا أبو معاوية قال: حدثنا ابن أبي ذئب عن الزهري عن أبان بن عثمان عن عثمان رضي الله عنه قال: كل طلاق جائز إلا طلاق النشوان وطلاق المجنون“ (سنن سعيد بن منصور ۲/۱۷۱ طبع بیروت، ابن ابی شیبہ ۱/۲۳۷، عمدة القاری شرح البخاری ۲۰/۲۵۱ طبع بیروت)۔

(۲) المغنی لابن قدامة ۱۱۵/۷۔

(۳) الدر المختار علی رد المحتار ۲/۳۱۳ طبع پاکستان۔

(۴) الفتاویٰ التارخانیہ ۲/۲۵۶ طبع پاکستان۔

یہ روایت دیگر متون میں مذکور قول مشتبی بہ سے متعارض ہے۔

بہر حال مسئلہ صرف اتنا ہے کہ صورت حال کے اندازہ میں دو شخصوں کی رائے مختلف ہو سکتی ہے، اس کی نظیر "تحری" ہے۔ جن علماء نے صورت حال کو اتنا سنگین تصور کیا، انہوں نے عدول کی رائے دی اور جنہوں نے حالات کو اتنا سنگین تصور نہیں کیا، انہوں نے عدول کو صحیح قرار نہیں دیا، یہی خلاصہ ہے اس بحث کا جو سمینار میں ہوئی۔ لیکن جب فقہی احکام اور مسائل کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے اور میدان سیاست کی گیند بنادیا جائے تو وہی سب کچھ ہوتا ہے جو ہورہا ہے، جن لوگوں نے کتاب نہیں پڑھی، جن کو یہی پتہ نہیں کہ امام زفر، امام طحاوی، صحابہ میں عثمان غنی اور ائمہ میں امام شافعی (ایک قول کے اعتبار سے) جس بات کے قائل ہوں، اس کو اگر کسی نے بر بنائے دلائل نہیں، بلکہ بر بنائے تغیر حال اور بر بنائے مصالح و مقاصد شرع، اختیار کر لیا تو معاذ اللہ اسے کفر و ارتداد تک پہنچانے کے لئے تیار کھڑے ہیں، اللہ ہم سب کے عملی و فکری گناہوں کو معاف فرمائے۔

میرے عزیز! آپ پہلے شخص ہیں جس نے مجھ سے براہ راست سوال کیا ہے، کاش! کہ آپ کے طریقہ پر دوسروں نے بھی عمل کیا ہوتا اور چند لمحات کے لئے کتب حدیث و فقہ کی طرف رجوع بھی کیا ہوتا، محض ضد اور عصبیت پر قائم نہیں رہتے تو ان کے لئے بھی بہتر ہوتا اور دین اور امت کے لئے بھی، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مکرہ کی دی ہوئی طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے

گزارش عرض یہ ہے کہ میرے شوہر محمد فاروق ساکن سر بہدی نے میرے اور میرے والدین اور بستی کے چند لوگوں کے سامنے مجھے تین طلاق دے دی، پھر بستی کے ایک آدمی جن کا نام سید وارث امام ہے انہوں نے میرے شوہر سے دریافت کیا کہ آپ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دیا ہے، میرے شوہر نے جواب دیا کہ ہاں، پھر انہوں نے پوچھا کہ کتنی طلاق دیا تو انہوں نے جواب دیا کہ تین

طلاق ہم نے دیا، اب ان کے رشتہ داروں نے یہ بات اڑائی ہے کہ چونکہ مفسدا ڈرا اور دھمکا کر طلاق لیا گیا ہے، اس لئے طلاق واقع نہیں ہوئی، حالانکہ یہ بات ایک دم غلط ہے، خود سے ہم دونوں کے مابین رضامندی سے طلاق ہوئی، اب حضور والا سے گزارش ہے کہ طلاق ہو گئی یا رجعی ہے، امید ہے کہ فوراً جواب سے مطلع فرمائیں گے۔

الجواب وبالله التوفیق

صورت مذکورہ میں جب آپ کے شوہر نے آپ کو تین طلاق دے دیا ہے اور گواہان بھی موجود ہیں تو آپ پر طلاق مغلظہ واقع ہو گئی اور آپ اپنے شوہر کے لئے بالکل حرام ہو گئیں، بغیر حلالہ شرعیہ کے دوبارہ نکاح جائز نہیں ہوگا (۱)، حلالہ شرعیہ کی صورت مشہور و معروف ہے۔

بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ ڈرا دھمکا کر طلاق لے لیا گیا ہے، اس لئے طلاق واقع نہیں ہوئی، درست نہیں ہے، کیونکہ بالفرض اگر لفظ طلاق کہنے پر جبر و باؤ دیا گیا ہو، پھر بھی شرعاً طلاق واقع ہو جاتی ہے جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے: "و یقع طلاق کل زوج بالغ عاقل ولو عبداً او مکرہا" (۲)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

طلاق علی مال طلاق بائن ہوتی ہے

مسماة زبیدہ خاتون بنت جناب ولی محمد کی شادی جناب علاء الدین ولد بشارت موضع داموسرائے سے ایک عرصہ ہوا ہوئی تھی، قریب چھ سال کی مدت گزرنے کے بعد لڑکی نے طلاق طلب کی اور لڑکانے تحریری طور پر طلاق بھی دے دیا جس کے ثبوت میں طلاق نامہ منسلک کیا جا رہا ہے، اس سانحہ کے قریب آٹھ ماہ گزر جانے پر لڑکی خود سے لڑکے کے گھر چلی گئی اور دوبارہ عقد

(۱) "فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدِ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ" (سورہ بقرہ ۲۳۰)۔

(۲) الدر المختار علی رد المحتار ۲/۲۵۳ طبع پاکستان۔

کر کے دونوں بہ حیثیت زن و شوہر ایک ساتھ رہنے لگے جس کے نتیجے میں قریب گیارہ مہینہ پر ایک بچہ بھی ہوا، تو کیا ایسی صورت میں ان دونوں کا طلاق اور پھر دوبارہ عقد کرنا شریعت کی رو سے درست ہوا؟

طلاق نامہ یہ ہے: داموسرائے و صیرنجیب پور کے کبھی بچوں کے سامنے تاریخ ۶۹/۶/۲۰ء کو بشارت میاں کا لڑکا محمد علاء الدین نے ولی میاں کی لڑکی زبیدہ خاتون کو، سب سامان لیتے ہوئے طلاق دیا، (محمد علاء الدین)۔

الجواب وبالله التوفیق

مسئلہ طلاق نامہ کا مضمون یہ ہے ”صیرنجیب پور و داموسرائے کے کبھی بچوں کے سامنے تاریخ ۶۹/۶/۲۰ء کو بشارت کا لڑکا محمد علاء الدین نے ولی میاں کی لڑکی زبیدہ خاتون کو، سب سامان لیتے ہوئے طلاق دیا“ یہ طلاق نامہ خلع ہے اور طلاق علی مال طلاق بائن ہوا کرتی ہے (۱)۔ لہذا اس طلاق نامہ کی رو سے زبیدہ خاتون پر ایک طلاق بائن واقع ہوگئی اور اس صورت میں عدت کے اندر یا عدت گزرنے کے بعد ہر دو حال میں زبیدہ خاتون کا دوبارہ نکاح علاء الدین کے ساتھ جائز ہے، لہذا جب زبیدہ خاتون نے دوبارہ نکاح علاء الدین کے ساتھ کیا تو یہ نکاح صحیح اور درست ہوا، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

لفظ ”جواب دیا“ سے کون سی طلاق پڑتی ہے

کیا فرماتے ہیں علماء دین مسئلہ ہذا میں:

زید نے گھریلو معاملہ کی بنا پر اپنی بیوی ہندہ کو مارا اور زبان سے مندرجہ ذیل الفاظ بیوی کو کہا:

ایک جواب، دو جواب، تین جواب، ہمارے یہاں سے جاؤ۔ صورت مذکورہ

(۱) ”(الواقع بہ) ولو بلا مال (وبالطلاق) الصریح (علی مال طلاق بائن)“ (الدر المختار علی رد المحتار ۳/۳۴۳ طبع پاکستان)۔

میں کون سی طلاق واقع ہوئی؟ کیا کوئی صورت جواز کی ہے یا نہیں؟
مذکورہ جملہ صرف چار عورتوں نے سنا، مرد کوئی موجود نہیں تھے، چار عورتوں کا بیان یہ ہے کہ زید نے کہا کہ ایک دو تین جواب دے دیا۔

الجواب وبالله التوفیق

ثبوت طلاق کے لئے صرف عورتوں کی گواہی معتبر نہیں ہے، اس لئے شوہر کے قول کا قسم کے ساتھ اعتبار ہوگا۔ اور جب زید کو اقرار ہے کہ زدو کو ب کے بعد اس نے اپنی بیوی سے کہا: ”ایک جواب، دو جواب، تین جواب، ہمارے یہاں سے جاؤ“ تو ایسی صورت میں اس کی بیوی ہندہ پر ایک طلاق بائن واقع ہوگئی اور وہ اس کی بیوی نہیں رہی، اگر وہ دونوں پھر میاں بیوی کی طرح ایک ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو ان دونوں کا آپس میں دوبارہ نکاح کر لینا جائز ہے۔

لفظ ”جواب دیا“ الفاظ کنائی میں سے ہے، لیکن عرف عام میں طلاق کے مفہوم میں مستعمل ہونے کی وجہ سے اس لفظ سے طلاق واقع ہونے کے لئے نیت کی ضرورت نہیں ہے، مگر اس لفظ سے طلاق بائن ہی واقع ہوگی، صورت مسئلہ میں جب شوہر نے بعد زدو کو ب بیوی سے کہا: ”ایک جواب“ تو اس کی بیوی اسی وقت بائن ہوگئی، اس کے بعد محل طلاق نہیں رہی کہ اس پر دوسری یا تیسری طلاق واقع ہو، ”البائن لا يلحق بالبائن“ (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

طلاق بالشرط کا مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین مندرجہ ذیل مسئلہ میں:

تقریباً آٹھ سال ہوئے کہ ایک بار چند ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا تھا، دوران گفتگو بحث یہ چل پڑی کہ اگر کوئی شخص یہ کہہ دے ”اگر میں شادی کروں گا تو میری بیوی کو طلاق ہے“ اس جملہ پر طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ دوسرے ساتھیوں کا کہنا

(۱) الدر المختار علی رد المحتار ۳/۵۴۰، ۵۴۲ بیروت۔

تھا کہ طلاق واقع ہو جائے گی، لیکن میں نے اس کی مخالفت میں یہ بات کہی کہ طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اس پر ساتھیوں نے کہا اگر نہیں واقع ہوگی تو تم یہ کہہ دو تو جائیں کہ اگر میں شادی کروں گا تو میری بیوی کو طلاق ہے، میں نے بھی ضد میں آکر مذکورہ بالا جملہ کو تین بار کہہ دیا۔ اس واقعہ کو کافی عرصہ گزر گیا اور میں اس کی تحقیق نہ کر سکا، پھر درازی مدت نے ذہن سے یہ بات نکال دی اور مجھے بالکل اس کا خیال دماغ میں نہ رہا کہ میں ایسا کر چکا ہوں، تقریباً پانچ سال بعد میری شادی ہوئی، میں بیوی کے ساتھ رہنے لگا، ابھی ایک ہفتہ کا واقعہ ہے کہ ایک ساتھی سے جو بحث میں موجود تھا ملاقات ہو گئی، میں نے اس سے اپنی شادی کا تذکرہ کر دیا تو وہ بہت ہی مغموم ہو گیا اور اس نے مجھے بہت ہی سمجھایا کہ تم نے تو شادی سے پہلے ہی طلاق دے رکھی تھی، تم کو وہ واقعہ بحث کا یاد نہیں، تم بیوی سے الگ ہو جاؤ، وہ تمہارے لئے حرام ہے، اب تک تم نے گناہ کیا وغیرہ وغیرہ۔ لہذا حضور والا سے گزارش ہے کہ مجھے صحیح اور شریعت کے مطابق جواب سے ممنون فرمائیں کہ واقعی میری بیوی مجھ پر حرام ہے یا نہیں؟ اور اب اس سے تعلق قائم رکھنے کی کوئی صورت ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق

صورت مسئلہ میں جب کہ آپ نے شادی سے پہلے تین بار کہا تھا "اگر میں شادی کروں گا تو میری بیوی پر طلاق ہے" اس کے بعد آپ نے شادی کی تو اسی وقت آپ کی بیوی پر طلاق مغلطہ واقع ہو گئی اور وہ آپ پر حرام ہو چکی (۱)، اب بغیر حلالہ شرعی کے آپ کے لئے اس سے دوبارہ نکاح کرنا بھی حلال نہیں ہے، حلالہ کی صورت مشہور و معروف ہے۔ واضح رہے کہ حلالہ کے بعد مذکورہ بیوی سے یا کسی دوسری عورت سے شادی کرنے کی صورت میں آئندہ طلاق واقع نہیں ہوگی۔

(۱) "فلو قال: المرأة التي أتزوجها طالق تطلق بتزوجها" (الدر المختار علی رد المحتار ۳/ ۵۹۴ طبع بیروت)۔

عالمگیری میں ہے: "إذا أضاف الطلاق إلى النكاح وقع عقيب النكاح نحو أن يقول لامرأته إن تزوجتك فانت طالق" (۱)۔

اور در مختار میں ہے: "لو قال إن دخلت الدار فانت طالق، إن دخلت الدار فانت طالق، إن دخلت الدار فانت طالق وقع الثلاث" (۲)۔
وقال الشامي: يعني بدخول واحد الخ (۳)، فقط، والله تعالى أعلم۔

لفظ "تلاک" میں نیت کا اعتبار

میرے سر اور والد کے درمیان کچھ نا اتفاقی چل رہی تھی جس کی وجہ کر میرے والد مجھے میری بیوی کو طلاق دینے پر مجبور کر رہے تھے، لیکن میں طلاق دینا نہیں چاہتا تھا، عید کے موقع پر کسی معمولی بات کو لے کر گھر میں جھگڑا ہو گیا، میری بیوی کو وہ گالی دینے اور مار پیٹ کرنے لگے، میں نے اپنی بیوی کو میکے پہنچا دیا، میرے کچھ ساتھیوں نے مجھ سے کہا: تم ایک شرط لکھو کہ ساس، سر یا سالایا بیوی وغیرہ سے دو سال تک کسی طرح کا لگاؤ اور آنا جانا نہیں ہوگا، مگر کچھ الفاظ غلط کر دو، تاکہ اس کا معنی مطلب درست نہ ہو، چنانچہ میں نے اس طرح کی شرط لکھی، "من کہ اسلام الدین ولد محمد شفیع عرف شاہ محمد ساکن ابراہیم پور چکریان، پرگنہ گوپار، تھانہ مشترک ضلع سارن کا ہوں، اپنے والد سے اقرار کرتا ہوں کہ اپنی بیوی، اپنے سر، اپنی ساس یا اپنے سالاے سے دو برس تک کوئی قسم کا آنا جانا یا نسبت قائم نہیں رہے گی، اس شرط کے خلاف ورزی اگر میں نے کیا تو میری بیوی مجھ پر حرام ہو جائے گی، گویا کہ "تلاک تلاک تلاک" فقط۔

(۱) الفتاویٰ البندیہ، الفصل الثالث فی تعلیق الطلاق ۱/ ۴۲۰۔

(۲) الدر المختار علی رد المحتار ۳/ ۵۶۳ طبع پاکستان۔

(۳) رد المحتار ۳/ ۵۶۳ طبع پاکستان۔

الجواب وبالله التوفيق

صورت مذکورہ میں لفظ "سلاک" کہنے سے اگر آپ کی نیت طلاق کی نہیں تھی اور تحریر لکھنے سے پہلے کسی کو گواہ بنا دیا تھا تو خواہ شرط پوری ہو یا نہ ہو طلاق واقع نہیں ہوگی اور نہ آپ کی بیوی آپ پر حرام ہوگی (۱)، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

طلاق سے متعلق متفرق سوالات

- (۱) بیوی کا سامنے رہنا لڑکی کی غیر موجودگی طلاق کے وقت چل سکتی ہے کیا؟
 - (۲) بیوی کے سر پرست کو اطلاع دینا یا سر پرست کے بغیر چل سکتا ہے؟
 - (۳) ایک طرف سے ہو سکتا ہے کیا، یعنی کافی گواہ بھی شوہر کے ہیں اور بیوی موجود نہیں، نہ اس کے رشتے دار۔
 - (۴) طلاق کا نام لڑکی نے سنا نہیں، ایسا ہو سکتا ہے کیا؟
 - (۵) جب کہ بیوی کا سامان جہیز اور نقد روپیہ مہر بغیر دیئے ہوئے طلاق ہو سکتی ہے کیا، اگر ایسی طلاق لڑکی کو منظور نہیں تو اس وقت کیا کیا جائے؟
 - (۶) مہر طلاق کے ساتھ دینا چاہئے یا بغیر مہر دیئے طلاق ہو جاتی ہے؟
 - (۷) پہلے طلاق یا مہر یا دونوں ایک ساتھ؟
 - (۸) شریعت کے طریقہ سے کس طرح بیوی سے رشتہ توڑا جاتا ہے، اس غلط طلاق نامہ کو کون سا نام دینا چاہئے؟
 - (۹) اگر دوبارہ میاں بیوی کا رشتہ قائم رکھنا چاہیں تو کس طرح رکھنا چاہئے؟
 - (۱۰) اگر میاں بیوی کا رشتہ توڑ ہی دینا ہے تو کیا کیا جائے؟
- اس وقت لڑکی کی مرضی بالکل نہیں ہے کہ وہ ایسے شوہر کے ساتھ زندگی گزارے

(۱) "وإن قال: نعمدته تحويفاً لم يصدق قضاء، إلا إذا أشهد عليه قبله، به يفتى" (الدر المختار علی رد المحتار ۲/۲۶۰ طبع بیروت)۔

جو بیوی کو ذلیل کرتا ہے اور ناحق بدنام کرتا ہے۔ تمام شرارت شوہر اور سسرال والوں کی ہے، ایسے طلاق اور رشتہ داری ہم کو منظور نہیں۔

یہ طلاق لڑکی قبول نہیں کر رہی ہے، اس لڑکے کو اور اس کے لوگوں کو بد معاش ٹھہرانا چاہتی ہے جن لوگوں نے یہ قیمتی زندگی ٹی وی کا سریل بنایا، وہ کہانی ہے، یہ زندگی ہے، تمام حالات معلوم کرائیں یا تنویر صاحب جو بک اسٹال پر رہتے ہیں ان کے پاس بھیج دیجئے، مہربانی ہوگی۔

الجواب وبالله التوفيق

(۱-۳) طلاق دیتے وقت بیوی کا سامنے رہنا یا الفاظ طلاق کا سننا ضروری نہیں ہے اور نہ لڑکی کے ذمہ داران کا وہاں حاضر رہنا ضروری ہے، اس کے بغیر بھی طلاق دی جائے تو لڑکی کو طلاق منظور ہو یا نہ ہو طلاق واقع ہو جائے گی (۱)، البتہ بہتر یہ ہے کہ شوہر اور بیوی کے درمیان نباہ مشکل ہو جائے تو لڑکے اور لڑکی کے اولیاء اور ذمہ داران ایک جگہ بیٹھ کر مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کریں، اگر نہ سلجھے تو دو گواہوں کے سامنے شرعی طریقہ پر طلاق دی جائے اور بیوی کے واجبات و حقوق ادا کئے جائیں، مناسب یہ ہے کہ کسی مقامی جانکار عالم یا ذمہ دار کو مجلس میں شریک کریں، باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَأَبْعَثُوا حَكَمًا مِنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا" (۲)۔

(۵-۱۰) اگر واقعہ شوہر نے یہ طلاق نامہ تیار کرا کے اپنے دستخط کے ساتھ بیوی کے نام روانہ کیا ہے تو اس کی روشنی میں ایک طلاق رجعی واقع ہوئی، اس لئے کہ نہ عدد طلاق کی صراحت ہے

(۱) "ولا يلزم كون الإضافة صريحة في كلامه لما في البحر لو قال: طالق فقبل له من عبث؟ فقال امرأتی طلقت امرأته" (رد المحتار باب الصريح ۳/۲۳۸ طبع پاکستان)

(۲) سورۃ نساء ۳۵۔

(۳) "(والطلاق يقع بعدد قرون به لانه) نفسه عند ذكر العدد وعند عدمه الوقوع بالصيغة" (الدر المختار علی رد المحتار ۳/۵۱۳، ۵۱۴ طبع بیروت)۔

اور نہ تکرار لفظ طلاق (۳)، لہذا شوہر کو حق ہے کہ تین حیض عدت کے اندر اندر وہ اپنی زوجہ کو دو گواہوں کے سامنے واپس لے لے (رجوع کر لے)۔ اگر رجوع نہیں کرے اور عدت گزر جائے تو لڑکی کو حق ہوگا کہ وہ اپنا نکاح کسی اور مرد سے کر لے اور چونکہ طلاق رجعی ہے، اس لئے بعد عدت بھی دونوں چاہیں تو آپس کی رضا سے آپس میں دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں، اگر شوہر بیوی کو لوٹانا نہیں چاہتا تو اسے چاہئے کہ اس کے حقوق بشمول مہر و سامان جہیز و نفقہ عدت اسے فوراً ادا کر دے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتاب الفسخ

لڑکی کا اپنے شوہر کے ساتھ رہنے سے انکار

مکرمی محترمی قبلہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب! مدظلہ العالی سوال: والدین نے اپنی لڑکی کا عقد نکاح ایک لڑکے سے کئی سال پہلے کیا تھا، اب عقد نکاح کے بعد لڑکی کسی بھی طرح اس شوہر کے ساتھ زندگی بسر نہیں کرتی ہے، نہ مرد خلع پر راضی ہوتا ہے اور نہ ہی وہ لڑکی کو طلاق دے کر اپنے عقد نکاح سے خارج کرتا ہے، عورت تو جوان ہے ہی، اب حالات بھی ایسے نہیں کہ عورت الزامات کی شکار نہ ہو، مرد ایک طرف نہ اس کو نان و نفقہ دیتا ہے اور نہ ہی اس سے ازدواجی زندگی بسر کرتا ہے، آج چھ سات سال کا عرصہ بھی گزر گیا۔ آپ سے التماس ہے کہ شرعی رہنمائی فرمادیں۔

الجواب وباللہ التوفیق

اگر لڑکی کا اپنے شوہر کے ساتھ رہنے سے انکار بلا وجہ شرعی ہے تو وہ لڑکی ناشزہ ہے اور مستحق نفقہ نہیں ہے، اور اگر کوئی وجہ شرعی موجود ہے، وہ کسی ظلم، کسی ضرر یا شریعت میں معتبر وجوہ کی وجہ سے شوہر کے ساتھ رہنے سے انکار کرتی ہے تو اس کا یہ انکار جائز ہوگا اور پھر شوہر کا اس کے حقوق کی ادائیگی سے گریز کرنا اس کا تعنت ہوگا، اس صورت میں زوجہ اپنے تمام حقوق پانے کی مستحق ہوگی، اور اگر وہ ان اسباب کی بنیاد پر تفریق چاہے تو معتبر اسباب کو سامنے رکھ کر قاضی اس کا نکاح فسخ کر سکتا ہے (۱)۔

(۱) "المنعنت: الممتنع علی الإنفاق ففي مجموع الأمير ما نصه: إن منعها نفقة الحال فلها القيام فبان لم يثبت عسره أنفق أو طلق، وإلا طلق عليه، قال محشيه: قوله وإلا طلق أي الحاكم من غير تلوم" (تكملة الناجزہ ۱۳۳ بحوالہ فتاویٰ علامہ سعید بن صدیق الفلانی المالکی)۔

اور اگر یہ ظاہری اسباب موجود نہ ہوں، لیکن طبعی ناپسندیدگی کی وجہ سے وہ اس شوہر کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو شوہر کا فرض ہے کہ وہ اس کا بالمعروف کی صورت نکالے، اگر ممکن نہ ہو تو تشریح بالا احسان یعنی خلع کی صورت میں زوجہ کو اپنے نکاح سے الگ کر دے، اور اگر زوج دونوں میں سے کوئی صورت نہیں نکالتا اور قاضی محسوس کرتا ہے کہ اب طرفین کے درمیان معروف اور بہتر تعلقات کے ساتھ نکاح کا برقرار رہنا ممکن نہیں ہے تو اس صورت میں (فقہ مالکی) کو سامنے رکھتے ہوئے وہ تحکیم اور پھر خلع جبری کی صورت نکال سکتا ہے (۱)۔

جو صورت آپ نے سوال میں لکھی ہے، بظاہر اب جس مقام پر معاملہ پہنچ گیا ہے کہ عورت نوجوان ہے، شوہر نہ اسے نان و نفقہ دیتا ہے اور نہ دیگر حقوق زوجیت ادا کرتا ہے، چھ سات سال کا عرصہ بھی گزر گیا، ایسی حالت میں فتنہ کا بھی اندیشہ ہے، لہذا قاضی تحرراً عن الفتنة اور خطرہ معصیت سے بچانے کے لئے بھی نکاح فسخ کر سکتا ہے۔

پس یہ معاملہ اگر آپ کے یہاں قاضی موجود ہوں تو ان کے پاس پیش کیجئے، یا پھر دارالقضاء جنوبی دہلی ۷۶/۱، مین بازار، اوکھلا نئی دہلی، ۱۱۰۰۲۵ یا دارالقضاء امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ سے رجوع کر سکتے ہیں، دارالقضاء امارت شرعیہ پھلواری شریف سے ”رہنمائے دارالقضاء“ اور ”کتاب الفسخ والتفریق“ نامی کتابچے بھی طلب کر سکتے ہیں، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

حکم کے فیصلہ سے پہلے فریقین کا تحکیم سے رجوع کرنا

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید امام مسجد ہے، کچھ لوگوں نے اس پر الزامات لگائے، لہذا شرعی فیصلے کے لئے کچھ حضرات کو

(۱) "فقال مالک يجوز لحكم الزوج أن يطلق المرأة بدون رضا الزوج ولحكم المرأة أن يخلع بدون رضا المرأة ويجب عليها المال إذا رأى الصلاح في ذلك، حيث ملك علي الحكمين الجمع والتفريق وكذب الزوج على نفى التفرقة" (الفتاوى المظہری ۱۰۱/۲ طبع رشیدیہ پاکستان)۔

مقرر کیا گیا، دوران سماعت جو حکم (ثالث) ہے اس کے رویے سے زید اور کچھ دوسرے لوگ خصوصاً زید کے حمایتی حضرات کو جانبداری کا شبہ ہوا، حتیٰ کہ حکم حضرات میں سے دو ایک نے دوران سماعت یہی بات کہی، اس صورت میں زید کو انصاف کی امید نہیں رہی تو کیا اسے شرعاً یہ حق ہے کہ حکم کی تبدیلی کا مطالبہ کرے؟ اگر حق نہ ہو تو جانبداری کی صورت میں اسے انصاف کیسے ملے گا؟

الجواب وبالله التوفيق

فریقین اپنے مقرر کردہ حکم (ثالث) کی تحکیم اور ثالثی سے، فیصلہ سے پہلے پہلے رجوع کر سکتے ہیں، لیکن اگر حکم نے فیصلہ دے دیا تو اب وہ فیصلہ فریقین پر لازم ہوگا، اب ثالثی سے رجوع جائز نہیں ہوگا۔

البحر الرائق میں ہے: "ولكل واحد من الحكمين أن يرجع قبل حكمه، فإن حكم لزمهما" (۱)۔

کتاب النفقة

نفقة مطلقہ کب تک شوہر پر واجب ہے؟

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

میری ہمیشہ جس کی عمر تقریباً ۳۵ سال ہوگی، ۲۶ سال قبل اس کی شادی ہوئی تھی، اس کے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہیں۔ بڑے لڑکے کی عمر ۲۳ سال ہے جو موٹر میکینک کا کام سیکھ رہا ہے اور ہزار روپے ماہوار بطور وظیفہ مل رہا ہے، لڑکی کی عمر ۲۰ سال اور چھوٹے لڑکے کی عمر ۱۶ سال ہے، مذکورہ تینوں اولاد میں سے ابھی کسی کی شادی نہیں ہوئی ہے، تین سال قبل اچانک بڑے لڑکے کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا۔ چند ماہ کے مسلسل علاج سے لڑکے کا دماغی توازن تو ٹھیک ہو گیا، مگر اس کی والدہ یعنی میری ہمیشہ کا (اپنے لڑکے کا دماغی توازن خراب دیکھ کر) دماغی توازن چلا گیا، اب اس کی دماغی کیفیت ٹھیک نہیں ہے، اس دماغی خرابی کی وجہ سے وہ سخت ست بکواس بھی کرتی ہے، جس پر اس کے شوہر نے غصہ میں تنگ آکر بجائے علاج کرانے کے اسے تینوں طلاق دے دی اور طلاق کی تحریری اطلاع مجھے کرا دی۔ اب جواب طلب سوال یہ ہے کہ مندرجہ بالا صورت حال میں کیا شوہر کے طلاق کے بعد میری ہمیشہ کی گذر بسر کی ذمہ داری مذہبی لحاظ سے اس کے شوہر پر بنتی ہے، جب کہ طلاق کا سبب بیماری بنا اور بیماری سے پہلے دوران شادی شدہ زندگی میری ہمیشہ نے اپنے شوہر کو کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا اور میری ہمیشہ کا میکے یعنی والدین کے مال میں بطور وراثت کے کوئی حق باقی نہیں رہ گیا ہے جو اس کا ذریعہ معاش بن سکے، نیز بچوں کو والد کی طرف سے یہ دھمکی ہے کہ اگر تم نے اپنی ماں کی کفالت اور دیکھ بھال کی تو میں تم کو اپنی جائیداد سے بے دخل

کردوں گا۔

ازراہ کرم میرے سوال کا مذہبی روشنی میں جواب سے مطلع فرمادیں۔

الجواب وبالله التوفیق

شوہر جس نے طلاق دے دی اب وہ اجنبی ہے، عدت کا نفقہ اس پر واجب ہے (۱) رہا اب اس خاتون کی کفالت کا مسئلہ تو از روئے شرع یہ اس کے بیٹے پر واجب ہے (۲)، اس کے باپ کا اس کو منع کرنا گناہ ہے، ایسے مسئلہ میں باپ کی بات نہیں مانی جائے گی، اگر لڑکا اس لائق نہیں ہے کہ اپنی ماں کی کفالت کر سکے تو باپ اور باپ نہیں ہو تو بھائی پر اس کی کفالت واجب ہے، شرع نے کسی کو بے سہارا نہیں چھوڑا ہے۔

ویسے اس مرد نے جن حالات میں اپنی زوجہ کو طلاق دی ہے یہ بہت بڑی بُرائی اور ظلم ہے، اگر سماجی طور پر ممکن ہو تو اس شخص کو مناسب اور ممکن سزا دی جانی چاہئے، تاکہ دوسروں کو عبرت ہو، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

نفقہ عدت کی مقدار

گذارش ہے کہ میرے اکلوتے بیٹے محمد طارق کی شادی شیبہ تبسم کے ساتھ ہوئی

(۱) مدت عدت میں نفقہ کے ساتھ کتنی بھی شوہر پر واجب ہے، جیسا کہ کتب حدیث میں مصرح ہے: "عن جابر عن النبی ﷺ قال: المطلقة ثلاثاً لها السكنى والنفقة" (سنن الدار قطنی ۳/۲۱ طبع عالم الکتاب بیروت)، "قلت کلہم ثقات علی اختلاف فی بعضہم" (اعلاء السنن ۱۱/۲۷۹ طبع پاکستان)، کتب فقہ میں "کسوة" کا بھی اضافہ ہے: "و (تجب النفقة والسكنى) وكذا الكسوة كما في أكثر المعنيرات" (مجمع الأنهر فی شرح مفتی الابرار ۱/۴۹۵)۔

(۲) "أما نفقة الوالدین فللقولہ تعالیٰ وقضى ربك أن لا تعبدوا إلا إياه وبالوالدین إحساناً" ای امر ربک... ووصى بالوالدین إحساناً والإنفاق علیہما حال فقرهما من أحسن الإحسان... (بدائع الصنائع ۳/۳۰ طبع کراچی پاکستان)۔

اور بھائی پر نفقہ واجب ہونے کی دلیل یہ حدیث ہے: "أبدأ بمن تعول أمك وأباك وأختك وأخاك" (سنن الترمذی ۵/۶۱ طبع استنبول)۔

نہی، لڑکی کا مہر ۱۵۰۰۰ ہزار روپے تھا۔ آپس میں کافی نا اتفاقی کی وجہ سے دونوں کی طلاق ہو گئی، میرا لڑکا سلائی کا کام کرتا ہے جس کی آمدنی محدود ہے۔ میں آپ سے فتویٰ لینا چاہتا ہوں کہ مہر کے علاوہ لڑکی کو عدت کا کتنا خرچ دیا جائے گا؟

الجواب وبالله التوفيق

اپنی آمدنی اور لڑکی کی رہائش کے معیار کو سامنے رکھ کر اوسط درجہ کا نفقہ دیا جائے گا، بہتر ہے کہ یا تو دونوں فریق کسی ایک مقدار پر اتفاق کر لیں یا قاضی کے پاس درخواست دے کر طے کرالیں (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مہر اور نان و نفقہ کا مطالبہ

بخدمت بابرکت علماء دین و شریعت!

بعد سلام سنت الاسلام گزارش یہ کہ میرا شوہر ایک وقت میں تین بار طلاق، طلاق، طلاق کہہ کر مجھے طلاق دے گیا اور قریب دو سال سے نہ مجھ سے کوئی رابطہ ہے نہ واسطہ، نہ کسی طرح کی کفالت کی ہے، آپسی منافرت کی انتہا ہے اور اب اس کے ساتھ میرا گزارہ قطعی ناممکن ہے، براہ کرم حکم شرعی بیان فرمائیں۔

۱- کیا مجھے طلاق ہو گئی؟

۲- کیا میں ابھی اور عدت طلاق گزارنے کی پابند ہوں؟

(۱) حضرت جابر سے مروی ہے: "سمعت رسول اللہ ﷺ يقول: للمطلقة الثلاث النفقة والسكنى مادامت في العدة" (سنن الدارقطني ۲۱/۳)۔

جہاں تک اس کی مقدار کی بات ہے تو اس کا واضح ذکر فقہی کتابوں میں نہیں ملتا ہے، البتہ مجمع الانہر کے حاشیہ میں اوسط درجہ پر سامان کفایت کا ذکر ہے: "قال واللام تشير الى انها غير مقدور فانها ما يكفيها من الوسط كما في المحيط" (درامتنی علی ہاشم مجمع الانہر ۱/۳۹۵ طبع بیروت)۔

۳- کیا میں مہر و نان و نفقہ اپنا اور بچوں کا مانگ سکتی ہوں؟

الجواب وبالله التوفيق

۱- صورت مسئلہ میں جب کہ شوہر نے تین بار طلاق دے دی جس کو دو سال کا عرصہ گزر چکا، تو تین طلاق مغلظہ واقع ہو گئی، تاریخ طلاق سے عدت گزار کر آپ کسی دوسرے مرد سے نکاح کر سکتی ہیں (۱)۔

۲- جب طلاق دے ہوئے دو سال گزر گئے تو بظاہر اس کی عدت گزر چکی ہے، عدت تین حیض ہے، حاملہ ہو تو ولادت تک ہے اور اگر عمر زیادہ ہو، یا عمر کم ہو اس لئے حیض نہیں آتا تو تین مہینہ ہے (۲)۔

۳- مطلقہ خاتون اپنا مہر اور اپنی عدت کا نفقہ اور اپنے بچوں کا نفقہ شوہر سے مانگ سکتی ہے (۳)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کیا بالغ لڑکیوں کا نفقہ والد پر واجب ہے؟

زید ایک سرکاری ملازم ہے جس کی دو بیویاں ہیں، پہلی بیوی کو ایک لڑکی بالغ یعنی بیس سال (غیر شادی شدہ) اور دوسری بیوی کو پانچ بچے ہیں، جس میں تین

(۱) قرآن کریم میں ہے: "فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ" (سورہ بقرہ ۲۳۰)۔

(۲) جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: "وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ" (سورہ بقرہ ۲۲۸)، "وَأُولَاتِ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ" (سورہ طلاق ۴) اور "وَالسَّامِيَّ يَتَبَوَّأُ الْمَجْزِيَّ مِنْ تَسَاتُلِكُمْ..." "فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ" (سورہ طلاق ۳)۔

(۳) گزری ہوئی عدت کا نفقہ شوہر کے ذمہ باقی رہے گا یا ساقط ہو جائے گا؟ اور بیوی کو اس کے مطالبہ کا حق ہوگا یا نہیں؟ اس میں حنفیہ کے یہاں دو رائے پائی جاتی ہیں: ایک یہ کہ ساقط نہیں ہوگا اور بیوی کو اس کے مطالبہ کا حق ہوگا، اس رائے کے قائل حلوانی ہیں، دوسری رائے یہ ہے کہ عدت گزر جانے کے بعد وہ شوہر کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا، یہ رائے امام سرخسی کی ہے، لیکن موجودہ زمانہ میں چونکہ حقوق کی ادائیگی میں عام طور پر کوتاہی برتی جاتی ہے اور نال منول کیا جاتا ہے، اس لئے حقوق کی حفاظت کی مصلحت کو سامنے رکھتے ہوئے گزری ہوئی عدت کا نفقہ شوہر سے ساقط نہ ہونے والی رائے ہی زیادہ مناسب ہے، دیکھئے ذوالحجہ ۱۴۰۵ ر ۳۳۳ طبع بیروت۔

لڑکیاں اور دولڑکے۔ جس میں سے ایک لڑکی بالغ عمر ۱۸ سال (غیر شادی شدہ) اور ایک لڑکا بھی بالغ یعنی ۱۹ سال ہے۔ زید نے تیسری شادی کر لینے کے بعد سے ان دونوں بیویوں اور بچوں کا کھانا، کپڑا، رہائش بند کر دیا ہے، کسی طرح دونوں بیویاں اپنی زندگی گزارنے کی کوشش کرتے ہوئے زندگی گزار رہی ہیں۔

ہمارے دوست جو گذشتہ سال ہی ایڈوکیٹ بنے ان کے ذریعہ عدالت میں دونوں بیویوں کی جانب سے دو مقدمے UNDER SECTION 125 C. R. P. C. دائر کئے گئے، معزز جج صاحب نے MAINTANANCE کرتے ہوئے بالغ لڑکی یعنی عمر ۱۸ سال کے دعویٰ کو یہ کہہ کر خارج کر دیا کہ لڑکی بالغ MAJOR ہوگی؟ اس کی اپیل کی گئی جو قبول کر لی گئی، (FANIAL HEARING) بحث کے موقع پر اس لفظ پر زیادہ توجہ دی گئی کہ ایسی بالغ غیر شادی شدہ لڑکی عمر ۱۹ سال جس کو خود اس کا باپ جو سرکاری نوکر ہے MAINTAIN نہیں کر رہا ہے، ایسی صورت حال میں لڑکی جو خود اس قابل نہیں ہے کہ اپنے آپ کو MAINTAIN کر سکے، صرف باپ ہی بالغ لڑکی کو MAINTANANCE کرنے کا ذمہ دار ہے، معزز جج صاحب نے فیصلہ محفوظ رکھا۔

تمام سینیئر ایڈوکیٹس کی رائے ہے کہ بالغ لڑکی کو MAINTANANCE پانے کے لئے قانون میں کوئی گنجائش نہیں ہے، قانون میں صرف پاگل بالغ لڑکی MAINTANANCE پانے کی حق دار ہے۔

جب قانون میں ایسی کوئی گنجائش نہیں کہ ایک بالغ لڑکی (عمر ۱۹ سال)

ہو جانے کی وجہ سے نفقہ سے محروم ہو جاتی ہے تو ایسی غریب لڑکی کا کیا ہوگا؟ کون سنبھالے گا اسے؟ یہ لڑکی بے یار و مددگار کدھر کدھر بھٹکے گی؟

ایسی لڑکی کے لئے شریعت کیا کہتی ہے؟ مسلم پرسنل لا بورڈ توجہ فرمائے، ایسی تمام مسلم بالغ غیر شادی شدہ لڑکیوں کے لئے کیا کر سکتا ہے؟ کیا کرنا چاہئے؟ کچھ اس طرح قانون بنانے کے لئے قدم اٹھایا جانا چاہئے کہ بالغ لڑکی کی شادی تک اس کا باپ MAINTANANCE کرتا یا MAINTANANCE (نفقہ) ادا کرتا۔

الجواب وبالله التوفیق

از روئے شرع اسلامی اولاد کا نفقہ باپ پر واجب ہے، اس سلسلہ میں قرآن کی آیت: ”وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ“ (۱) اور ”وَعَلَى الْوَارِثِ مِنْهُ ذَلِك“ (۲) سے استدلال کیا گیا ہے، اولاد میں اگر لڑکے ہوں تو بالغ ہونے تک ان کا نفقہ ان کے والد پر واجب ہے، الا یہ کہ لڑکے ہاتھ پیر سے معذور یا کمانے کے لائق نہ ہوں تو ان کا نفقہ باپ پر واجب رہے گا، لڑکی کے بارے میں شریعت کا اصول یہ ہے کہ جب تک اس کا نکاح نہ ہو جائے اس کا نفقہ باپ پر واجب رہے گا، الا یہ کہ وہ خود ایسی جائد اور کھتی ہو، جس کی آمدنی سے اس کی کفالت ہو سکے۔

شریعت کا اصول یہ ہے کہ کوئی بھی شخص کسی بھی وقت بے سہارا نہ رہے، اسی لئے لنگڑے، اولھے اور معذور لڑکے کا نفقہ بالغ ہونے کے باوجود باپ پر برقرار رہتا ہے، لڑکیاں اگر ہوں تو شریعت انہیں کام کرنے اور روزی کمانے پر مجبور کرنا نہیں چاہتی، بلکہ جب تک غیر شادی شدہ ہیں، والد پر اور جب شادی ہو جائے تو شوہر پر اور اگر شوہر بھی نہ ہو اور بالغ اولاد نہ ہو تو اس پر اس کا نفقہ واجب قرار دیا گیا ہے، اسی طرح شرع میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ کن حالات میں کس پر نفقہ واجب ہوگا اور آخر میں جب کوئی بھی کفالت کرنے والا موجود نہ ہو تو ریاست پر اس کی ذمہ داری

(۱) سورۃ بقرہ ۲۳۳۔

(۲) سورۃ بقرہ ۲۳۳۔

آتی ہے، اس سلسلہ میں کہ بلوغ کے بعد بھی شادی تک لڑکی کا نفقہ والد پر واجب رہتا ہے، فقہاء کی تصریحات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

فتح القدیر میں ہے: "فالأنات عليه نفقتهن إلى أن يتزوجن إذا لم يكن لهن مال وليس له أن يواجرهن في عمل ولا خدمة وإن كان لهن قدرة وإذا طلقت وانقضت عدتها عادت نفقتها على الأب" (۱) (لڑکیوں کے پاس اگر مال نہ ہو تو شادی تک ان کا نفقہ باپ پر ہے اور باپ کو یہ حق نہیں ہے کہ لڑکیوں کو اجرت پر کام میں اور خدمت پر لگائے، خواہ وہ اس کی قدرت رکھتی ہوں اور اگر اسے طلاق پڑ جائے اور اس کی عدت گزر جائے تو دوبارہ اس کا نفقہ باپ پر لوٹ آئے گا)۔

اور شامی میں ہے: "(وإذا) تجب (للولده الكبير العاجز عن الكسب) كآنتى مطلقاً" (قولہ كآنتى مطلقاً) أي ولو لم يكن بها زمانة تمنعها عن الكسب فمجرد الأنوثة عجز إلا إذا كان لها زوج فنسقتها عليه مادامت زوجة" (۲) (اسی طرح اس لڑکے کا نفقہ بھی باپ پر واجب ہوگا جو کمانے سے عاجز ہے جیسا کہ لڑکی کا نفقہ علی الاطلاق باپ پر واجب ہوتا ہے (خواہ انہیں کمانے کی قدرت ہو یا نہ ہو ہر دو صورت میں) (صاحب درمختار کا قول "كآنتى مطلقاً") یعنی اگرچہ لڑکی کو ایسا لونچ پن نہ ہو جو اسے کمانے سے باز رکھے تو محض نسوانیت ایک عاجزی ہے، مگر جب کہ اس کا شوہر ہو تو جب تک وہ بیوی رہے اس کا نفقہ شوہر پر ہے)۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: "ونفقة الأنات واجبة مطلقاً على الآباء ما لم يتزوجن إذا لم يكن لهن مال كذا في الخلاصة" (۳) (اور لڑکیوں کا

(۱) فتح القدیر ۳/۱۳ طبع بیروت۔

(۲) الدر المختار مع رد المحتار ۳/۱۵ طبع بیروت۔

(۳) الفتاویٰ الہندیہ ۱/۵۶۳ طبع بلاق مصر۔

نفقہ باپ پر مطلقاً واجب ہے جب تک ان کی شادی نہ ہو، اگر ان کے پاس مال نہ ہو، اسی طرح "الخلاصة میں ہے)۔

رہا مسئلہ 125 C.R.P.C. کا تو ظاہر ہے کہ یہ دفعہ C.R.P.C. (کریمیل پروسلیجو رکوڈ) کی ہے، اس کا تعلق دیوانی حقوق سے نہیں ہے، یہ محض فوری راحت رسائی کی دفعہ ہے، جو ایک حق دیوانی کے حصول کو فوری اور آسانی کے ساتھ حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، چونکہ ہندوستان میں "مسلم پرسنل لا" نافذ ہے، جب بھی کوئی مقدمہ سول کورٹ کی صورت میں جج کے سامنے جائے گا وہ مسلم پرسنل لا کی روشنی میں اس پر مجبور ہوگا کہ لڑکی کو تانکاج باپ سے نفقہ دلائے، ۱۲۵ چونکہ عارضی راحت رسائی کی دفعہ ہے اور اس میں جن کمیٹیگوریز کا ذکر کیا گیا ہے ان میں اولاد کے معاملے میں (Minor) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی نابالغ کے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکیاں بلوغ کے بعد اپنے حق نفقہ کے حصول کے لئے اس قانون سے فائدہ نہیں اٹھائیں، یہ اس قانون کا بڑا نقص ہے، مجھے دوسرے مذاہب کے بارے میں معلوم نہیں، لیکن شریعت محمدی کا قانون بے حد معقول اور منصفانہ ہے کہ جب تک لڑکیاں شادی شدہ نہ ہو جائیں باپ پر ان کی ذمہ داری عائد رہنی چاہئے۔ اگر اس قانون سے غیر مسلم لڑکیاں بھی فائدہ اٹھاتی ہیں تو یہ عین تقاضہ انصاف ہے، لہذا ضرورت اس کی ہے کہ لڑکیوں کو تانکاج اپنے نفقہ کے حصول کے لئے دیوانی عدالت میں طویل مقدمہ بازی میں الجھانے کی بجائے انہیں (125 C.R.P.C.) کے تحت فوری راحت دلائی جائے، اس سلسلہ میں ضرورت ایک چھوٹی سی ترمیم کی ہے کہ دفعہ ۱۲۵ میں جہاں (Minor) کا ذکر آیا ہے وہاں نابالغ لڑکے اور لڑکیوں کے علاوہ لڑکیوں کے حق میں خصوصیت کے ساتھ "تانکاج" کے لفظ کا اضافہ کیا جائے، لڑکوں کے سلسلہ میں بھی بعض خاص جزئیات جو بلوغ کے بعد ان کو مستحق نفقہ قرار دیتی ہیں ان کا اضافہ کیا جانا چاہئے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتاب الوقف

باب الوقف علی الاولاد

وقف علی الاولاد کا حکم

محترم و مکرم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہندوستان پر برطانوی حکومت کے دور میں جب یہاں کی عدالتوں نے مسلمانوں کے وقف علی الاولاد کو قانونی طور پر تسلیم کرنے سے انکار کیا اور اس وقت کی اعلیٰ ترین عدالت مرافعہ پریوی کاؤنسل نے بھی عدالتوں کے اس موقف کی تائید کی تو اس کے خلاف ہندوستان کے علماء نے رائے عامہ ہموار کرنے کی مہم شروع کی اور بالآخر مرکزی مجلس قانون ساز سے وقف علی الاولاد کے جواز کا قانون منظور کروایا۔

پریوی کاؤنسل کے نزدیک وقف علی الاولاد کے قانوناً قابل تسلیم ہونے کے وجوہ میں بڑی وجہ یہ تھی کہ پریوی کاؤنسل کے ارکان اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھے کہ اپنی ہی اولاد کی فلاح کے لئے جائداد کا وقف کرنا بھی اسلامی تصور میں صدقہ و خیرات کے دائرہ میں آتا ہے، اس کے رد میں ہمارے علماء نے قرآن، حدیث اور آثار صحابہ کے حوالہ سے کہا کہ شریعت اسلامی میں صدقہ و خیرات صرف غیروں ہی کے لئے نہیں، بلکہ اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنا بھی صدقہ و خیرات میں داخل ہے، چنانچہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۷ سے استدلال کیا گیا جس میں "ذَوِی الْقُرْبٰی" کا لفظ آیا ہے، آیت "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ" (۹۲:۳) کے نزول کے بعد صحابی رسول حضرت ابو طلحہ کے اس واقعہ کو

پیش کیا گیا کہ انہوں نے اپنا دل پسند باغ رسول اللہ ﷺ کے مشورہ سے اپنے چچا زاد بھائی پر صدقہ کیا، صحیح مسلم کی روایت پیش کی گئی جس میں اللہ کے رسول نے صدقہ کی مدات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا "ان میں سب سے زیادہ اجر اپنے بال بچوں پر صرف کرنے کا ملے گا"۔ نیز ترمذی شریف، ابن ماجہ اور نسائی میں وارد اس حدیث سے استفادہ کیا گیا کہ "مسکین کو صدقہ دینا صرف صدقہ ہے، قرابت دار کو صدقہ دینا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی"۔ صحابہ کے وقف علی الاولاد کی مثالیں پیش کی گئیں کہ حضرت زبیر بن عوام نے اپنا ایک مکان اپنی مطلقہ لڑکیوں پر وقف کیا، حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مکہ کے مکان کو اور حضرت عمرو بن العاصؓ نے اپنے طائف اور مکہ کے مکانات اپنی اولاد پر وقف کیں۔

غرض یہ ہے کہ اسلام میں صلہ رحمی کی ترغیب و تاکید ہے، صلہ رحمی کا دائرہ صرف اولاد تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس میں دوسرے اعزہ و اقرباء ("ذَوِی الْقُرْبٰی" ۲: ۱۷) بھی شامل ہیں، علامہ شبلی نے اپنے رسالہ "وقف علی الاولاد" میں لکھا ہے: "اس بنا پر اسلام نے وقف کو اولاد اور اعزہ تک وسعت دی"۔

تو کیا وقف کے دائرہ کو صرف وقف کی اپنی اولاد تک محدود رکھنا صحیح ہے یا اپنی اولاد کے علاوہ دیگر اقرباء مثلاً حقیقی یا غم زاد بھائیوں، بہنوں اور ان کی اولاد، یا چچا، تایا وغیرہ اور ان کی اولاد اور اسی طرح دوسرے اقرباء اور ان کی اولاد پر بھی مثل وقف علی الاولاد وقف کیا جاسکتا ہے، اگر وقف کی اپنی اولاد کے علاوہ دوسرے اعزہ و اقرباء اور ان کی اولاد در اولاد کے استفادہ کے لئے وقف کیا جاسکتا ہے، تو اس کی تشہیر ہونی چاہئے، اس لئے کہ عام طور پر یہی خیال ہے کہ صرف وقف علی الاولاد ہی کیا جاسکتا ہے اور دوسرے اعزہ و اقرباء اور ان کی اولاد در اولاد کے استفادہ کے لئے وقف قائم نہیں کیا جاسکتا۔ اگر شرعاً یہ پوزیشن واضح ہے کہ دوسرے اعزہ و اقرباء اور ان کی اولاد در اولاد کے استفادہ کے لئے وقف قائم

کیا جاسکتا ہے تو اسلامک فقہ اکیڈمی اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے باہمی تعاون سے اس بات کی تشہیر و اشاعت کریں اور اس کے ساتھ ہی وقف علی الاولاد کے نافذ الوقت قانون میں ضروری ترمیم کروائی جائے اور اگر اس مسئلہ پر قطعیت کے ساتھ رائے نہیں دی جاسکتی تو فقہ اکیڈمی سوالنامہ مرتب کر کے گشتی خطوط کے ذریعہ علماء کی رائے حاصل کرے یا تیرہویں سمینار کے لئے اسے موضوع بنائے۔

الجواب وبالله التوفیق

وقف علی الاولاد اور وقف علی الاقارب سے متعلق آپ کے سوالات موصول ہوئے، ذیل میں مختصر جواب پیش ہے۔

ہر کار خیر پر وقف کرنا درست ہے، وقف کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے: "حبس العین و صرف المنفعة فی جهة الخیر المؤبدۃ" (۱)، چنانچہ سماج کے مختلف کمزور طبقات اور رفاہ عام کے متنوع کاموں پر وقف کی مثالیں دور صحابہ سے ہی ملتی ہیں۔

اعزہ و اقرباء کے ساتھ صلہ رحمی اور ان کی معاونت و کفالت بہت بڑا خیر ہے، قرآن کریم کی متعدد آیات میں اہل قرابت کے ساتھ حسن سلوک کا تاکید دیا گیا ہے (۲)۔

احادیث میں اپنے اہل خاندان اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک و صلہ رحمی کو دوہرے اجر کا موجب بتایا گیا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ حضرت زینبؓ اور ایک خاتونؓ نے حضور ﷺ سے اپنے شوہر اور گود کے یتیم بچوں پر صدقہ کرنے کی بابت دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "لھما اجران: أجر القرابة وأجر الصدقة" (۳) (ان دونوں کے لئے

(۱) اصل مال کو روکنا اور آمدنی کو دائمی مدت خیر پر خرچ کرنا وقف کہلاتا ہے۔

(۲) دیکھئے: "وبالوالدین إحساناً و ذی القربی" (سورہ بقرہ ۸۳)، "وأتی المال علی حبہ ذوی القربی" (سورہ بقرہ ۸۷)، "وبالوالدین إحساناً و ذی القربی" (سورہ نساء ۳۶)، "إِنَّ اللَّهَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْإِحْسَانِ وَ إِیتَانِ ذِی الْقَرْبِی" (سورہ نمل ۹۰) اور "تَبْتَیْنَا ذَا مَقْرَبَةٍ" (سورہ بلد ۱۳)۔

(۳) صحیح مسلم بشرح النووی، کتاب الزکاة ۹۲/۳ طبع قاہرہ۔

دو اجر ہیں: ایک قرابت کا اجر اور دوسرے صدقہ کا اجر)۔

حضرت میمونہ بنت حارثؓ نے حضور ﷺ کو ایک باندی آزاد کرنے کی خبر دی تو آپ ﷺ نے فرمایا: "لو أعطیتھا أحوالک کان أعظم لأجرک" (۱) (اگر تم نے وہ باندی اپنے ماموں کو دیا ہوتا تو تمہیں زیادہ اجر ملتا)۔

بنو عذرہ کے ایک شخص نے اپنا مدبر غلام آزاد کر دیا، حضور ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے اس غلام کو فروخت کر دیا اور قیمت آزاد کرنے والے شخص کو دے کر فرمایا: پہلے اپنی ذات پر خرچ کرو، کچھ بچ جائے تو اپنے اہل پر خرچ کرو، اہل سے کچھ بچے تو اپنے قرابت داروں پر خرچ کرو (۲)۔

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "أعظمھا أجراً الذی أنفقته علی أھلک" (۳) (سب سے زیادہ اجر اس مال میں ہے جو تم اپنے اہل پر خرچ کرو)۔ حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ "تم اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو" (۴)۔

اس طرح کی متعدد احادیث میں اپنے بال بچوں، اہل خاندان اور قرابت داروں پر خرچ کو دیگر کار خیر میں خرچ پر ترجیح دی گئی ہے، اسی لئے صحابہ کرام نے تعلیمات نبوی اور اسوۂ نبوی کو سامنے رکھتے ہوئے اہل خاندان و قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کیا اور ان کے لئے

(۱) الصحیح لمسلم بشرح النووی، کتاب الزکاة ۹۲/۳ طبع قاہرہ۔

(۲) پورا واقعہ اس طرح ہے: "عن جابر قال: أعتق رجل من بنی عذرہ عبداً له عن ذہر فبلغ ذلک رسول اللہ ﷺ فقال: "ألک مال غیرہ" فقال: لا، فقال: "من یشتريه منی" فاشتره نعيم بن عبد الله العدوي بشمان مائة درهم، فجاء بها رسول الله ﷺ فدفعها إليه، ثم قال: أبداً بنفسك فتصدق عليها فإن فضل شيء فلاهلك فإن فضل عن أهلك شيء فلهدي قرابتک" (۱) (صحیح مسلم بشرح النووی، کتاب الزکاة ۹۰/۳ طبع قاہرہ)۔

(۳) الصحیح لمسلم بشرح النووی، کتاب الزکاة ۸۹/۳۔

(۴) "صلی أمک" (صحیح مسلم بشرح النووی، کتاب الزکاة ۹۰/۳)۔

اوقاف قائم فرمائے۔

اسلامی تاریخ میں حضرت عمر بن خطابؓ کا قائم کردہ وقف نشان راہ کی حیثیت رکھتا ہے، خلیفہ دوم کا یہ وقف حضور علیہ الصلاۃ والسلام کے وقف کے بعد اسلام میں اولین وقف تھا اور وقف کے بنیادی احکام و ضوابط کا ذکر اسی وقف میں کیا گیا ہے، اس وقف سے متعلق روایت کے الفاظ لائق توجہ ہیں: "عن ابن عمر أن عمر بن الخطاب أصاب أرضاً بخير فأتى النبي ﷺ يستأمره فيها فقال: يا رسول الله! إني أصبت أرضاً بخير لم أصب مالا قط أنفس عندي منه، فما تأمرني به، قال: إن شئت حبست أصلها وتصدقت بها، قال: فتصدق بها عمر أنه لا يباع ولا يوهب ولا يورث، وتصدق بها في الفقراء وفي القربى وفي الرقاب وفي سبيل الله وابن السبيل، والضيف لا جناح على من وليها أن يأكل منها بالمعروف أو يطعم غير ممتول" (۱) (حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کو خیبر کی ایک زمین ملی تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس اس زمین کے بارے میں مشورہ کرنے آئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے خیبر میں ایک زمین ملی ہے جس سے بہتر مال مجھے کبھی نہیں ملا، آپ ﷺ مجھے اس کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو اس کے اصل کو باقی رکھ کر اس (کی منفعت) کو صدقہ کر دو، ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اس کو صدقہ کر دیا اس شرط کے ساتھ کہ وہ نہ فروخت کی جائے گی، نہ ہبہ کی جائے گی اور نہ اس میں وراثت جاری ہوگی اور انہوں نے (اس کی منفعت) کو فقراء، اہل قرابت، غلام کی آزادی، اللہ کی راہ، مسافر اور مہمان کے لئے صدقہ کر دیا اور یہ کہ اس کے متولی کے لئے کوئی حرج نہیں کہ اس میں سے معروف طریقے پر کھائے اور کھلائے، البتہ اس کو اپنے لئے مال نہ بنائے۔

اس روایت سے واضح ہے کہ حضرت عمرؓ کا وقف اہل قرابت پر بھی تھا، حضرت علیؓ

(۱) صحیح البخاری، کتاب الشروط ۱۸۵/۳ طبع استنبول، اس کے علاوہ یہ حدیث الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ صحیح مسلم، کتاب الوصیہ ۱۲۵۵/۱ سنن ابی داؤد، کتاب الوصایا ۲۹۸/۳ وغیرہ میں ہے۔

نے "بیع" کی ایک زمین جن لوگوں پر وقف فرمائی تھی ان میں "ذوی الرحم" کے الفاظ آئے ہیں (۱)۔

حضرت ابو طلحہ نے بیرحاء کو جب اللہ کے لئے وقف کیا تو حضور ﷺ نے انہیں حکم فرمایا: "اجعلها في قرابتك" (۲) (اسے اپنے قرابت داروں کو دے دو)۔

امام بخاری نے صحیح بخاری میں ایک عنوان قائم فرمایا ہے: "إذا وقف أو وصی لأقاربہ" (جب کوئی شخص اپنے اقارب کے لئے وقف یا وصیت کرے) اور اس باب کے تحت حضرت ابو طلحہ کا مذکورہ واقعہ نقل فرمایا ہے (۳)۔

امام ابو بکر احمد بن عمر و شیبانی معروف بہ خصاف کی اہم و مشہور کتاب "احکام الأوقاف" میں قرابت داروں پر وقف کے تعلق سے مذکور ہے: "اگر کوئی شخص یوں کہے کہ میری یہ زمین اللہ تعالیٰ کے لئے دائمی طور پر میرے قرابت داروں پر وقف ہے، وہ ختم ہو جائیں تو مساکین پر ہے، تو یہ وقف جائز ہے" (۴)۔ ایک دوسری جگہ پر امام موصوف نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ اہل قرابت پر واقف جس ترتیب سے وقف کرے وقف درست ہوگا اور اسی ترتیب سے ان پر صرف کیا جائے گا (۵)۔

لہذا اقرباء پر وقف کیا جاسکتا ہے اور وقف علی الاقارب کے جواز میں کسی طرح کا کوئی تذبذب نہیں ہے۔

اب رہا سوال کہ قرابت داروں پر وقف کیا وقف علی الاولاد میں شامل ہے یا وقف علی

- (۱) کتاب احکام الأوقاف للخصاف ۱۰۔
- (۲) سنن ابی داؤد، باب فی صلۃ الرحم ۳۱۸/۲ طبع استنبول، یہی روایت صحیح البخاری، کتاب الوصایا میں دوسرے الفاظ کے ساتھ ہے، نیز دیکھئے: معالم السنن شرح سنن ابی داؤد ۶۸/۱ طبع بیروت۔
- (۳) صحیح البخاری، کتاب الوصایا ۱۹۰/۳ طبع استنبول۔
- (۴) "أرایت الرجل إذا قال: أرضی هذه صدقة موقوفة لله عز وجل أبداً علی قواہی فاذا انقرضوا فہی علی المساکین؟ قال: الوقف جائز" (احکام الأوقاف للخصاف ۳۲/ طبع قاہرہ)۔
- (۵) احکام الأوقاف للخصاف ۱۶۳، ۱۶۵۔

الاقرباء مستعمل نوع ہے؟ یہ قابل غور ہے۔

اس سلسلہ میں یہ اصول پیش نظر ہونا چاہئے کہ اوقاف میں واقف جو الفاظ استعمال کرتا ہے ان میں عرف کا اعتبار ہوتا ہے، علامہ ابن نجیمؒ "الاشباہ والنظائر" میں لکھتے ہیں: "الفاظ الواقفين تبني على عرفهم" (۱) (وقف کرنے والوں کے الفاظ ان کے عرف پر مبنی ہوتے ہیں)۔

پس یہ دیکھا جائے گا کہ اولاد کے لفظ سے عرف میں کیا مراد لیتے ہیں، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب المقابر

قبرستان کی آمدنی کا مصرف

کیا فرماتے ہیں علماء دین و شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ پر:

۱- قبرستان جو بالکل لاوارث ہے، غیر محفوظ جگہ پر ہے، اس پلاٹ کی اراضی ۶۵ رڈ سمل ہے، بیچ کا حصہ آس پاس کے لوگوں نے مٹی کاٹ کاٹ کر بہت بڑا گڈھا بنا دیا ہے، ایک چوتھائی زمین پڑتی (ویران، غیر آباد) قدیم ہے، اس میں قبر کے نشانات نہیں ہیں، یہ زمین مین روڈ پر واقع ہے، قیمتی زمین ہے، باقی حصہ میں زمانہ قدیم کے مزارات پختہ ہیں۔

مین روڈ سے متصل زمین پر پانچ چھ دوکانیں بن سکتی ہیں، اس کی آمدنی سے جو بڑا گڈھا ہے اس کو بھرا جاسکتا ہے، میونسپل ایریا میں ہونے کے سبب گورنمنٹ کے کسی فنڈ سے امداد بھی مل سکتی ہے، ایم پی اور ایم ایل اے فنڈ سے قبرستان کی چار دیواری کے لئے مل سکتا ہے، مگر زمانہ کی گردش و تعصب کی نذر ہو گیا ہے، کوشش کی جا رہی ہے، مگر گڈھا بھرنے کے لئے نہیں ملے گا، لہذا دوکانیں بن جانے سے اس کی آمدنی سے اس کو بھرا جاسکتا ہے۔

پڑتی زمین کے آس پاس شیشم وغیرہ کے درخت بھی لگائے جاسکتے ہیں۔

۲- درخت کی آمدنی کا مصرف کیا ہوگا؟ درخت کی آمدنی قبرستان کی مرمت و حفاظت میں خرچ کیا جاسکتا ہے؟ تو پھر دوکانوں کو بھی بنانے کی گنجائش ہونی چاہئے، تاکہ اس کی آمدنی سے قبرستان کی حفاظت و مرمت میں خرچ کیا جائے۔

۳- قبرستان کے اندر کے درختوں کی آمدنی سے گاؤں، محلہ کے انجمن میں شادیوں کی ضروری اشیاء، جیسے دیگ، برتن، جزیر، دری وغیرہ خرید کر اپنے محلہ اور ارد گرد کے لوگوں کو کرایہ پر دیا جاسکتا ہے اور آمدنی بڑھائی جاسکتی ہے، کیا

شریعت میں اس کی اجازت ہے؟

الجواب وبالله التوفیق

سوال میں مذکور صورت حال میں اصل قبرستان کے ہی ضائع ہو جانے کا خدشہ ہے، اس صورت میں قبرستان کی سڑک کے کنارے خالی زمین پر (جہاں نئی قبریں نہ ہوں) دکان تعمیر کرالینا اور پھر اس کی آمدنی اس قبرستان کے تحفظ پر اور اگر اس قبرستان میں ضرورت نہ ہو تو دوسرے ضرورت مند قبرستانوں کی احاطہ بندی وغیرہ پر اور اگر یہ مصرف بھی موجود نہیں تو مسلمان بچوں کی تعلیم پر (جو اس وقت کی بڑی اہم ضرورت ہے) صرف کرنا جائز ہے، فقط (۱)، واللہ تعالیٰ اعلم۔

ویران مقابر اور اوقاف کے احکام - بدلتے ہوئے حالات میں

عرصہ سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ قبرستان کے بارے میں شرعی احکام کیا ہیں، یہ جانتا ہوں کہ "جنت البقیع" میں ایک ہی جگہ پر چند برسوں کے بعد نئے مردے دفن کئے جاتے ہیں، یہ بھی جانتا ہوں کہ سعودی عرب میں مزارات اور قبے مسمار کئے گئے اور پرانے قبرستان رفاہ عام کے کاموں میں لئے جاتے ہیں، بمبئی میں جگہ ختم ہونے پر عام قبرستان بند کر دیے جاتے ہیں اور پھر اس کے چار برس کے بعد وہ قبرستان دوسرے مصرف میں لیا جاسکتا ہے، پرائیویٹ قبرستانوں کی بات اور ہے۔

پورے پنجاب میں گاؤں گاؤں قبرستانوں کی زمین غاصبانہ قبضہ میں چلی گئی اگر وہ باضابطہ حکومت کے حوالہ کی جائیں، معاوضہ کے ساتھ یا بغیر معاوضہ کے، وہ زیادہ بہتر ہے۔

(۱) "ولو بلسی السمیت وصار قبراً جاز دفن غیرہ وزرعہ والبناء علیہ" (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق ۲۳۶/۱ طبع امدادیہ لبنان)، نیز دیکھئے: رد المحتار ۳/۱۳۸ طبع بیروت، الفتاویٰ الہندیہ ۱۶۷/۱۔

نگہور میں لوگ پرانے قبرستانوں کی زمین پر تجارتی عمارتیں بنانا چاہتے ہیں۔

اس لئے اس مسئلہ پر آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔

الجواب وبالله التوفیق

پرائی قبروں میں دوسری میت کی تدفین

۱- قبریں جب پرانی ہو جائیں اور بظاہر حال لاش مٹی ہو چکی ہو تو اس جگہ دوسری میت کو دفن کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

علامہ ابن ہمام جو فقہاء اسلام میں بڑا بلند مقام رکھتے ہیں، وہ ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں لکھتے ہیں کہ کوئی قبر دوسری میت کے لئے نہ کھودی جائے، الا یہ کہ پہلی قبر پرانی ہو گئی ہو کہ ہڈیاں بھی نہ بچی ہوں، لیکن اگر دوسری جگہ نہیں مل رہی ہو تو ہڈیاں رہتے ہوئے بھی دوسرے مردہ کو اس میں دفن کیا جاسکتا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ پہلے مردہ کی ہڈیاں جمع کر کے ایک طرف رکھ دی جائیں اور نئے میت اور ان ہڈیوں کے درمیان مٹی وغیرہ کے ذریعہ آڑ بنا دی جائے:

"ایک قبر دوسرے شخص کی تدفین کے لئے نہیں کھودی جائے گی، سوائے اس کے کہ پہلی نعش بوسیدہ ہو گئی ہو اور اس کی ہڈیاں تک نہ بچی ہوں، ہاں اگر کوئی دوسری قبر فراہم نہ ہو سکے تو پہلی نعش کی ہڈیاں ایک جگہ کر دی جائیں گی، اور دونوں کے درمیان مٹی کی رکاوٹ بنا دی جائے گی" (۱)۔

رہا یہ کہ قبر پرانی نہیں ہوئی ہو اور اسے کھود کر دوسرے مردے کو دفن کرنا پہلی میت کی بے حرمتی اور منکر یعنی ناپسندیدہ عمل ہے، اس لئے یہ درست نہیں ہوگا۔

"حلیہ" نامی کتاب میں لکھا ہے: "خصوصیت سے اس وقت جب اس میں ابھی ایک نعش بوسیدہ ہی نہیں ہوئی ہے، دوسرے کی تدفین مکروہ ہے، اور بعض جاہل

(۱) "ولا يحفر قبر لدفن آخر إلا إن بلى الأول فلم يبق له إلا عظم إلا أن لا يوجد بد فبضم عظام الأول ويجعل بينهما حاجزاً من تراب" (فتح القدیر ۲/۱۵۰ طبع بیروت)۔

گورکن جو غش کو بوسیدہ ہونے سے پہلے ہی قبر کو کھود ڈالتے ہیں اور نئے مردے دفن کر دیتے ہیں اس کا منکر ہونا بالکل واضح ہے" (۱)۔

یہ بھی فقہاء نے تصریح کر دی ہے کہ "ایک قبر میں دوسرے مردہ کو دفن کرنا جس ضرورت اور مجبوری کے تحت درست ہے، اس کے ذیل میں اپنے رشتہ داروں کے قریب دفن ہونے کا جذبہ، یا اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کرنے کا جذبہ داخل نہیں ہے، دوسرے قبرستان میں جگہ ہو تو اس کی اجازت نہیں ہوگی کہ ایک قبر میں دوسرا مردہ دفن کر دیا جائے" (۲)۔

زیلعی نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ اگر قبر پرانی ہو چکی ہو اور لاش مٹی کی صورت میں بدل چکی ہو تو وہاں دوسری قبر بنائی جاسکتی ہے:

"اگر غش بوسیدہ ہوگئی اور مٹی بن گئی تو دوسرے کا اس قبر میں دفن کرنا، اس میں کاشت کرنا اور اس پر عمارت بنانا جائز ہے" (۳)۔

علامہ شامی نے اس سلسلہ میں اچھی بحث کی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر میت کے لئے ایسی قبر فراہم کرنا جس میں کبھی کوئی دوسرا دفن نہیں ہوا ہو، ناممکن بات ہے، ورنہ زمین کا ہر حصہ قبروں سے بھر جائے گا، خاص کر بڑے شہروں میں سخت دشواری ہوگی، اس لئے اصول یہی بہتر ہے کہ قبر کی قدامت پر حکم کو مبنی رکھا جائے، اور قدیم قبروں پر جدید قبریں بنانے کی اجازت دی جائے:

"میں کہوں گا: اس میں بڑی مشقت ہے، اس لئے بہتر ہے کہ بوسیدگی کو کچھ دوسرے مردہ کی تدفین کے جواز کے لئے مدار بنایا جائے، کیونکہ ہر مردہ کے لئے ایسی قبر کی فراہمی جس میں کوئی اور دفن نہ ہو، چاہے پہلی غش مٹی ہی کیوں نہ بن گئی ہو ممکن نہیں ہے، خصوصاً بڑے اور وسیع شہروں میں" (۱)۔

(۱) "وخصوصاً ان کماں فیہا میت لم یل، وما یفعلہ جہلۃ الحفارین من نیش القبور التي لم تبلى اربابہا وإدخال أجانب علیہم فهو من المنکر الظاہر" (رد المحتار ۳/۸۳ طبع بیروت بحوالہ الحلیۃ)۔

(۲) "قال الزیلعی: ولو بلسی المیت وصار تواباً جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ" (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق ۲/۲۶۱ طبع امدادیہ ملتان)۔

خلاصہ یہ ہے کہ قبریں اگر قدیم ہوں تو ان پر دوبارہ قبریں بنائی جاسکتی ہیں۔

۲- رہا سوال سعودی عرب میں مزارات کا مسمار کیا جانا، تو ظاہر ہے کہ یہ تشدد سعودیوں کا کام تھا جسے اس زمانہ کے علماء نے بھی پسند نہیں کیا تھا اور نہ آج جو کچھ سعودی عرب میں ہو رہا ہے، اس کا ہر عمل شرعی حجت کا درجہ رکھتا ہے۔

قبرستان سے دوسرا مصرف لیا جانا

۳- تیسرا سوال ہے قدیم قبرستان سے دوسرا مصرف لیا جانا، میرے خیال میں اگر قبرستان کسی شخص کا ذاتی ہے، جیسا کہ اکثر بعض مقامات پر لوگ اپنی ذاتی ملک میں اپنے مردوں کو دفن کرتے ہیں اور وہ اراضی اپنی ملک سے خارج نہیں کرتے اور نہ دوسروں کو دفن کی عام اجازت دیتے ہیں، ایسے مقابر میں اگر قبریں پرانی ہو جائیں اور لاش کے مٹی ہو جانے کا گمان غالب ہو جائے تو پھر ایسی پرانی قبروں کی جگہ پر نہ صرف یہ کہ دوسرے مردوں کو دفن کرنا جائز ہوگا، بلکہ اس پر کاشت کرنا اور تعمیر کرنا بھی درست ہوگا، جیسا کہ زیلعی کی تصریح میں نے اوپر نقل کی جس میں انہوں نے "جواز وزرعہ والبناء علیہ" (۲) لکھا ہے۔

غرض یہ کہ مسئلہ کے دو پہلو ہیں، ایک احترام میت، تو وہ قدامت کی وجہ سے رکاوٹ باقی نہیں رہا، دوسرے یہ کہ وہ اراضی ملک ہے یا وقف۔ تو ملک کی وجہ سے مالک کو ان کے مالکانہ تصرفات کے حقوق بھی حاصل ہو جاتے ہیں جو احترام میت کے پیش نظر قبروں کے جدید ہونے کی صورت میں اس کے لئے ممنوع تھے۔

اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اراضی قبرستان کے لئے وقف صراحتہ کی گئی یا اذن عام

(۱) "قلت: لكن في هذا مشقة عظيمة، فالأولى إناطة الجوار بالبلاء، إذا لا يمكن أن يعد لكل ميت قبر لا يدفن فيه غيره، وإن صار الأول تواباً لا سيما في الأمصار الكبيرة الجامعة" (رد المحتار ۳/۸۳، ۱۳۹، ۱۳۸ طبع بیروت)۔

(۲) تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ۲/۲۶۱ طبع امدادیہ ملتان۔

دفن موتی کے لئے دے دیا گیا اور لوگوں نے اس میں دفن کرنا شروع کر دیا، تو اس صورت میں اراضی وقف قرار پائیں اور اب ان پر وقف کا قانون نافذ ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ قبرستان کی حیثیت عام وقف کی ہے اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق نہ حکم حاکم ضروری ہے اور نہ زبان سے کہنا اور نہ کسی متولی کا قبضہ ضروری ہے، اگر عملاً کسی اراضی پر مردوں کو دفن کیا جانے لگے تو ملک زائل ہو جاتی ہے اور اس کی حیثیت عام وقف کی ہو جاتی ہے، یعنی قرائن و آثار سے اجازت کا واضح ہو جانا کافی ہے۔

”امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک محض زبان سے کہہ دینے کی وجہ سے واقف کی ملک زائل ہو جائے گی اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جب لوگ ستایہ سے پانی کھینچنے لگیں، مسافر خانوں اور رباطوں میں رہنے لگیں اور قبرستان میں تدفین شروع کر دیں تب ملک زائل ہوگی اور مبسوط میں ہے کہ ان مسائل میں فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے اور اس پر امت کا اجماع ہے“ (۱)۔

اور جب قبرستان وقف ٹھہر اتوا اب اس کی بیع درست نہیں اور نہ وہ کسی کی ذاتی ملک قرار دیا جاسکتا ہے۔

”اور جب وقف صحیح ہو گیا تو اب نہ اس کا بیچنا درست ہے اور نہ کسی اور کو مالک بنانا“ (۲)۔ لہذا جہاں تک قبرستانوں کی بیع کا سوال ہے، اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی، البتہ یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ قدیم اور ویران قبرستان جن سے دفن موتی کا مصرف عرصہ دراز سے نہیں لیا جا رہا ہے اور نہ آئندہ یہ مصرف لئے جانے کا بظاہر امکان ہے، ایسے قبرستان کی اراضی کو کیا کیا جائے، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ اس کا قوی امکان ہے کہ ان اراضی پر غاصب لوگ قبضہ کر لیں گے، جن کو ہٹانا ناممکن ہے، یا بیحد دشوار، میری رائے میں ایسے قبرستان کی اراضی کو کرایہ (Lease) پر دیا جاسکتا ہے اور یہی اقرب الی الفقہ ہے۔

(۱) ”وعند أبي يوسف يزول ملكه بالقول كما هو أصله وعند محمد...“ (الفتاویٰ البندیہ ۲/۲۶۵)۔
(۲) ”وإذا صح الوقف لم يحز بيعه ولا تملكه“ (الہدایۃ علی فتح القدر ۶/۲۰۳، ۲۰۵ طبع بیروت)۔

فقہاء نے اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے کہ اگر کسی موقوف مقاصد وقف کو پورا کرنے کے لائق نہیں رہے تو اس کا دوسرا مصرف لیا جاسکتا ہے، یا نہیں؟ اور اس سے آمدنی حاصل کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ مثلاً کوئی عمارت وقف تھی اور وہ منہدم ہو گئی اور اب کوئی ایسا ذریعہ آمدنی نہیں جس کے ذریعہ دوبارہ اسے آباد کیا جائے تو امام محمد کے نزدیک وہ اراضی بانی یا ورثاء بانی کی طرف منتقل ہو جائے گی اور امام ابو یوسف کے نزدیک اس کی حیثیت وقف برقرار رہے گی، لیکن امام محمد کا قول بھی اس صورت میں ہے جب کہ قطعی طور پر مفاد وقف کا حصول ختم ہو چکا ہو، اگر کسی صورت میں بھی استفادہ ممکن ہے تو پھر وہ بانی کی طرف نہیں لوٹے گی (۱)۔

مثلاً دکان جل کر خاک ہو گئی، تعمیر کا خرچ نہیں اور اسے کرایہ پر لگانے کی بھی کوئی صورت نہیں، لیکن اگر وہ اراضی ذریعہ آمدنی ہو سکتی ہے تو وہ وقف برقرار رہے گی اور اسے اجارہ پر لگایا جاسکتا ہے۔

مختلف فقہاء نے بدلتے ہوئے حالات کو پیش نظر رکھ کر مسجد سے متعلق بہت سے سامانوں کی منتقلی کا فتویٰ دیا ہے اور بعض لوگوں کے سامنے یہ صورت پیش آئی کہ بادشاہ وقت نے کسی ویران مسجد کے قیمتی پتھروں کو دوسری مسجد میں لگانا چاہا اور استفتاء کیا، انہوں نے شریعتی کے قول پر فتویٰ دیتے ہوئے اس سے منع کر دیا، بادشاہ تو رک گیا لیکن پھر دوسرے لوگوں نے اس سے ذاتی فائدہ اٹھایا، جس پر انہیں سخت ندامت ہوئی، شامی نے یہ ساری بحث ”نقل انقاض مسجد“ کی بحث میں کر دی ہے (۲)۔

پس پنجاب وغیرہ کی صورت حال جہاں سرے سے ان قبرستانوں کے ختم ہو جانے کا خدشہ ہی یقینی ہے، ایسے مجتہد فیہ مسائل میں کسی ایک پہلو پر ایسا اصرار جس سے دین کے عام مصالح مجروح ہوتے ہوں صحیح نہیں معلوم ہوتے، لہذا ایسے قدیم مقابر جو عرصہ سے غیر آباد ہیں اور آئندہ بھی ان کے آباد ہونے کی توقع نہیں ہے، ان پر عمارتیں بنا کر کرایہ پر لگائی جاسکتی ہیں اور ان اراضی کو بھی لیز پر دیا جاسکتا ہے، تاکہ اصل اراضی وقف کی حیثیت میں باقی رہ سکے اور اس سے آمدنی حاصل ہوتی رہے۔

(۱) رد المحتار ۶/۵۷۳ طبع بیروت، الفتاویٰ الحاکمیۃ علی البندیہ ۳/۳۱۳۔

(۲) رد المحتار ۶/۵۵۰، ۵۵۱ طبع بیروت۔

”فتاویٰ خانہ“ میں ہے کہ مسافر خانہ جو رہ گزرنے والے مستغنی ہوں اور راستے کے قریب ہی دوسری سرائے موجود ہو تو سید امام ابو شجاع کا خیال ہے کہ اس کا سامان دوسری سرائے میں استعمال کر دیا جائے گا، جیسا کہ مسجد ویران ہو جائے اور گاؤں کے لوگ اس سے مستغنی ہو گئے ہوں، پھر معاملہ قاضی کے سامنے پیش کیا جائے، وہ ٹکڑی فروخت کر دے اور اس کی قیمت دوسری مسجد میں لگا دے، تو جائز ہے، اور بعض حضرات کا خیال ہے کہ اب وہ واقف کی میراث شمار ہوگی، یہی حکم اس حوض کا بھی ہے جو عوامی مفاد کے لئے وقف کیا گیا ہے اور اب قابل استعمال باقی نہ رہا ہے (۱)۔

نیز ذخیرہ میں شمس الائمہ حلوانی سے منقول ہے کہ ”ان سے ایسی مسجد یا حوض کے بارے میں دریافت کیا گیا جو ویران ہو گئے ہوں اور لوگوں کے وہاں سے چلے جانے کے باعث اب اس کی ضرورت باقی نہ رہی ہو، کیا قاضی کو حق ہوگا کہ اس کے اوقاف کسی اور مسجد یا حوض میں لگا دیے جائیں، انہوں نے جواب دیا، ہاں“ (۲)۔

اور ایسے ہی البحر الرائق میں ”قنیہ“ نامی کتاب سے نقل کیا گیا ہے ”..... مناسب ہے کہ ایک وقف کا سامان دوسرے وقف میں منتقل کرنے کے مسئلہ میں امام ابو شجاع، امام حلوانی کے فتویٰ کی اتباع کی جائے کہ اس مسئلہ میں مسجد یا حوض کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، یہ دونوں بیروی کے لئے کافی ہیں، خصوصاً ہمارے زمانے میں، اس لئے کہ مسجد، سرائے یا حوض وغیرہ کو اگر منتقل نہ کیا جائے تو اس کے شکستہ حصے چور اور غارت گرا اٹھالے جائیں گے، جیسا کہ مشاہدہ و تجربہ ہے، نیز خود اوقاف کے نگران وغیرہ اسے کھا جائیں گے اور منتقل نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسری مسجد بھی جس کو اس کی ضرورت ہے ویران ہو جائے گی“ (۳)۔

(۱) الفتاویٰ القاضی علی ہاشم البندہ ۳/۱۵۲، رد المحتار ۶/۵۳۹، ۵۵۰۔

(۲) رد المحتار ۶/۵۳۹، ۵۵۰، طبع بیروت، البحر الرائق ۵/۲۲۳۔

(۳) البحر الرائق ۵/۲۲۳۔

جب وقف کی عمارت منہدم ہو جائے اور اس شی وقف کے لئے کوئی ایسا سامان نہ ہو جس کے ذریعہ اس کی تعمیر کی جاسکے تو امام محمدؒ کے نزدیک یہ وقف بانی یا اس کے ورثاء کی طرف لوٹ جائے گا، بخلاف امام ابو یوسفؒ کے، لیکن امام محمدؒ کے نزدیک وہ شی واقف یا اس کے ورثاء کی طرف لوٹائی جائے گی جو مکمل طور پر اس لائق باقی نہ رہی ہو، جس مقصد کے لئے واقف نے وقف کیا تھا، مثلاً دکان جو جل گئی ہو، اور اس سے اب کچھ بھی کرایہ حاصل نہ ہو سکتا ہو اور مسافر خانہ اور حوض جو تباہ ہو گیا ہو اور اس کی تعمیر کے لئے کچھ نہ ہو اور جو عمارت کہ وقف کی گئی ہو، وہ واقف کی ملک میں واپس نہیں آسکتی، اور اس کا میدان وقف ہی رہے گا، جو کرایہ پر دیا جائے گا، اگرچہ تھوڑا سا کرایہ حاصل ہو، بخلاف سرائے کے جہاں تک رستاق کی بات ہے تو وہ کبھی کبھی ویران ہو جاتا ہے اور وہ ڈھیر بن جاتا ہے اور وہ اس حالت میں ہو جاتا ہے کہ اگر عمارت کا شکستہ حصہ منتقل کر دیا جائے تو اس کی زمین ایسے شخص کو کرایہ پر دی جاسکتی ہے جو تعمیر کرے یا درخت لگائے، اگرچہ کرایہ کم حاصل ہو (۱)۔

خلاصہ یہ کہ متقدمین کے فتویٰ سے بہت کرم تاخرین محقق علماء کی دوسری رائے قائم کرنے کی علت یہ ہے کہ وقف اپنے مقاصد کو پورا نہیں کر رہا ہے اور اگر اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو غاصبین اس پر قبضہ کر لیں گے، درانحالیکہ دوسری مساجد کو ضرورت ہے، پس اگر اس ویران مسجد کے سامان دوسری ضرورت مند مساجد کو منتقل کرنا ممنوع قرار دیا جائے تو اس فتویٰ کے ذریعہ دوسری مساجد کو ویران کرنا لازم آئے گا، لہذا مصلحت شرع اس کی متقاضی ہے کہ اس انتقال کو درست قرار دیا جائے۔

خلاصہ بحث

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ غیر آباد قدیم اور ویران قبرستانوں کو اگر لیز پر لگا دیا جائے تو ہزار ہا قبرستان جو ابھی آباد ہیں اور ان کا تحفظ خطرہ میں ہے، ایسے قبرستانوں کے تحفظ کی صورت نکالی

(۱) رد المحتار ۶/۵۳۹۔

جاسکتی ہے، لہذا میرے نزدیک شرع اسلام کی رو سے ایسے ویران اور قدیم قبرستانوں کو تعمیرات یا کاشت کے لئے لیز پر دیا جاسکتا ہے۔

اور اس طرح کی آمدنی کو اولاً دیگر مقابر کے تحفظ یا ایسے شہروں اور آبادیوں کے لئے قبرستان کی اراضی حاصل کرنے پر خرچ کرنا چاہئے جہاں قبرستان کی ضرورت ہے، اگر اس طرح کے مدات پر خرچ کے بعد رقم بچ جائے تو اسے مدارس، مسافر خانوں، نادار بچوں کی تعلیم اور دوسرے رفاہی کاموں پر خرچ کیا جاسکتا ہے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب المساجد

مسجد کی زمین میں تدفین

مسجد کی زمین پر کسی خاص خاندان یا کسی بھی عام آدمی کو دفن کرنا کیسا ہے؟ اگر کسی نے مسجد کی زمین پر قصد او جبراً دفن کر دیا تو مدفون کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اس زمین پر مسجد کی تعمیر ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق

مسجد کی زمین میں مردوں کی تدفین جائز نہیں ہے، واقف نے اس زمین کو مسجد پر وقف کیا ہے، تاکہ اس کا فائدہ اور منفعت مسجد کو حاصل ہو، الا یہ کہ واقف نے بوقت وقف اس کی بھی صراحۃً اجازت دے دی ہو، یہ خوب جان لینا چاہیے کہ باب وقف میں واقف کے منشاء اور اس کی غرض کی رعایت ضروری ہے، جیسا کہ رد المحتار میں ہے: "ومراعاة غرض الواقفين واجبة" (۱)، اور یہاں اس زمین میں مردہ کو دفن کرنا واقف کے منشاء کے خلاف ہے اس لئے جائز نہیں ہوگا۔ اگر وہ قبر اتنی پرانی ہو گئی ہو کہ اس کے آثار و نشانات مٹ چکے ہوں اور مردہ سرگھل کر مٹی ہو گیا ہو تو بعینہ اس جگہ پر مسجد کی تعمیر جائز ہے۔ علامہ زیلعی نے لکھا ہے: "ولو بلى الميت وصار تراباً جاز دفن غيره في قبره وزرعه والبناء عليه" (۲) اور اگر قبر نئی ہو تو پھر اسے گھیر دیا جائے اور اس پر مسجد کی تعمیر کی جائے، فقط واللہ اعلم۔

مکانوں کے اوپر مسجد کی تعمیر

عرض خدمت یہ ہے کہ یہاں ایک مسلم کالونی میں بستی کے اہل خیر حضرات نے ایک جگہ خریدی ہے، شروع ہی سے ان کی نیت ہے کہ نیچے کمرہ جات بنائے

(۱) رد المحتار ۶/۶۶۵ طبع دارالکتب العلمیہ بیروت۔

(۲) تبیین الحقائق ۲۴۶/۱ طبع امدادیہ لبنان، رد المحتار ۱۳۸/۳ طبع دارالکتب العلمیہ بیروت۔

جائیں اور کرایہ پر دئے جائیں اور ان کمروں کے اوپر مسجد تعمیر کی جائے، نیچے کے کمروں کا کرایہ مسجد کے مصارف میں خرچ ہوگا، نیز نیچے ہی کمروں کے بازو میں وضو خانہ اور طہارت خانہ وغیرہ ہوں گے۔

آج کل شہروں میں جگہ کی قلت اور تنگی ہے، اگر نیچے ہی مسجد بنائی جائے تو طہارت خانے وغیرہ بننے کے بعد بہت تھوڑی جگہ بچتی ہے، اس چھوٹی سی جگہ پر کمرہ بنائے جا رہے ہیں۔

آں محترم سے دریافت طلب یہ امر ہے کہ آیا اس طرح مسجد کی تعمیر درست ہے یا نہیں؟ کیونکہ جگہ کے خریداروں کی نیت شروع ہی سے نیچے کمرہ جات، طہارت خانہ اور اوپر مسجد کی تعمیر کی ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ مسجد کے نیچے سوائے مسجد کے اور کوئی عمارت نہیں بنائی جاسکتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو طہارت خانے وغیرہ بھی تعمیر نہیں ہو سکیں گے، براہ کرم اس سلسلہ میں رہنمائی فرما کر مشکور فرمائیں۔

اپنی اولین فرصت میں جواب سے نوازیں یہ خصوصی درخواست ہے۔

الجواب وبالله التوفیق

مسجد کی تعمیر اور بنا کے وقت اگر بانیان مسجد نے یہ طے کر لیا کہ منصوبہ کے مطابق نیچے کی منزل ضروریات مسجد، بیت الخلاء، وضو خانہ، امام و مؤذن کی رہائش یا مسجد کے انتظامی اخراجات کے لئے دکانیں جو ذریعہ آمدنی ہوں بنائی جائیں گی اور اوپر کی منزل پر مسجد ہوگی تو ایسا کرنا جائز ہوگا، اعتبار بوقت بناء مسجد کے بانیوں کی نیت کا ہوگا، البتہ جب مسجد بن چکی، اس کے بعد مسجد کی کسی منزل میں اس کی حیثیت کو بدلنا درست نہیں ہوگا (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱) "وإذا جعل تحته سرداباً لمصالحه أي المسجد (جاء) " "ولو بني فوقه بيتاً للإمام لا يضر لأنه من المصالح، أما لو تمت المسجدية ثم أراد البناء منع" (رد المحتار ۶/۵۳۷، ۵۳۸، طبع بیروت)۔

کتاب الہبۃ والوصیۃ

عقد ہبہ کے لئے قبولیت ضروری ہے

ہم نے جوڑ کی کو بری میں سات جوڑے کپڑے چڑھائے تھے جن کو بہو کے گھر والوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ یہ دو دو سو روپے کے سوٹ ہیں، یہ دلہن کے لائق نہیں ہیں، لیکن اب وہ لوگ ان جوڑوں کو بھی مانگ رہے ہیں۔
برائے مہربانی آپ شریعت کی روشنی میں ان سب حالات کو پڑھ کر فتویٰ دیں
آپ کی عین نوازش ہوگی۔

الجواب وبالله التوفیق

جو کپڑے دلہن کو دئے گئے اور وہ ناپسند کر کے واپس کر دئے گئے اور پھر ان کے بدلہ میں دوسرا کپڑا نہیں بھیجا گیا تو اب اس کا مطالبہ دلہن کی طرف سے صحیح نہیں ہوگا، چونکہ اس نے ہبہ کو قبول نہیں کیا اور شئی موہوبہ کو اپنے قبضہ میں بھی نہیں رکھا اور عقد ہبہ کے لئے قبولیت ضروری ہے، لہذا ملک اس کی موکد نہیں ہوئی، اس لئے اب واپسی کا مطالبہ صحیح نہیں ہوگا (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

ہبہ اور وصیت کا مسئلہ

حامد اومصلیاً، عالی جناب مفتی صاحب! مدظلہ العالی
مندرجہ ذیل امور میں جو منسلک دستاویز سے متعلق ہیں استفتاء کیا جا رہا ہے، امید
کہ بہ عجلت مکنتہ فتویٰ تحریر فرما کر ممنون و مشکور فرمائیں گے۔
من مستفتی محمد عبدالعزیز کے والد صاحب کا انتقال ماہ جنوری ۱۹۹۲ء میں ہو چکا

(۱) "ورکنہا" ... (الإيجاب والقبول) ... وتنصح (قبول) (وتسمی الہبۃ بالقبض) الكامل
(الدر المختار علی رد المحتار ۸/۳۹۰، ۳۹۲، ۳۹۳، طبع بیروت)۔

ہے، ان کی یہ دستاویز منسلک ۱۹۸۶ء کی ہے، ان کی وفات کے وقت ان کی اولاد میں پانچ بیٹے اور ایک بیٹی اور ایک دوسری لاولد زوجہ تھی اور اب بھی حیات ہیں۔ پہلی زوجہ منکوحہ سے تمام اولاد ہوئی، جن کو میرے والد نے حیات طلاق دے دی تھی اور مہر بھی ادا کر دیا تھا، والد صاحب کی جملہ جائیداد مندرجہ دستاویز منسوب ہے، والد صاحب مرحوم نے مجھے تقریباً دس بارہ سال ہوئے بذریعہ اخبار رہنمائے دکن مجھے تافرمانی اور عدول حکمی و بغاوت کے تحت عاق کر دیا تھا، لیکن والد مرحوم نے اپنی حیات میں وفات سے تقریباً چھ ماہ قبل ہم پانچوں بیٹوں اور ایک بیٹی کو اپنے پاس بلا کر نقد رقم اس طرح تقسیم کی کہ ہر بیٹے کو ڈھائی ڈھائی ہزار روپے اور بیٹی کو پانچ ہزار روپے نقد عنایت فرمائے اور ہر بیٹے کو مکانات کی تعمیر اور رہائش کے لئے پانچ پانچ پلاٹ اراضی دی، اس میں وہ بیٹے بھی شریک ہیں جن کو عاق کر دیا تھا یا دستاویز میں ان کو جائیداد متروکہ سے بھی محروم کر دیا ہے۔

۱- کیا شرعی حیثیت سے عاق شدہ لڑکا محروم الارث قرار پاتا ہے یا مستحق ارث ہے اور اگر بھائی بہن ان کو حصہ دیں تو کیا وہ گنہگار ہوں گے اور کیا محروم کی وفات سے چھ ماہ قبل کے سلوک اور احسان سے عاق ہونا یا محروم الارث ہونا کالعدم قرار پاتا ہے اور وہ جائیداد میں مستحق وارث قرار پاتے ہیں؟

۲- دستاویز منسلک میں میرے والد صاحب مرحوم نے جو اپنی موجودہ زوجہ فاطمہ بیگم کو مکان (نمبر ۱۰۱، ۱۰۳) کے متصل ۲۵x۲۵ کے چار عدد کمرہ جات مہر کے تحت دے دیئے ہیں، کیا وہ ان کی مالک قرار پاتی ہیں؟ جب کہ ان پر ان کا قبضہ ثابت نہیں، کیونکہ تاحیات والد صاحب ہی کرایہ پر دیتے رہے اور کرایہ وصول کرتے رہے اور نہ دستاویز میں قبضہ کا ذکر ہے، دستاویز ہذا کے شروع میں وصیت نامہ درج ہے، ہیہ نامہ نہیں ہے۔

۳- امینہ بیگم و خدیجہ بیگم جو دستاویز ہذا میں ان کی حقیقی بہنیں ہیں، ۲۳ عدد کمرہ جات میں لڑکے اور لڑکیوں کے وارث ہوتے ہوئے یہ بھی وارث ہو سکتی ہیں اور مکتوبہ دسویں حصے کی یا کیا صورت ہوگی؟

۴- جائیداد متروکہ کی تقسیم کس طرح عمل میں آئے گی؟ براہ کرم وضاحت سے لکھئے۔
مورث حاجی عثمان ولد عبداللہ پارکھ، تین پانچ بیٹے، ایک بیٹی، زوجہ لاولد، دو عدد بہنیں۔

نوٹ: براہ کرم مطلع فرمائیے کہ اس دستاویز منسلک میں جو جملہ جائیداد بتلائی گئی ہے، شرعی حیثیت سے کون کون مستحق قرار پاتے ہیں اور کتنی جائیداد کے اور کون مستحق قرار نہیں پاتے۔

الجواب وباللہ التوفیق

میں نے حاجی عثمان صاحب ولد عبداللہ پارکھ، ساکن عادل آباد کے وصیت نامہ مورخہ ۸۶/۹/۲ء کی فوٹو کاپی دیکھا، اس تحریر میں تین باتیں کہی گئی ہیں:

۱- ”جنگلات، آفس کے متصل خالی جگہ ۱۰۰x۲۰ کو میں نے میرے لڑکے عبدالغفار صاحب کو بیع دے کر رجسٹری کر دیا ہے، رجسٹری کے بعد عبدالغفار صاحب نے اس بیع شدہ جگہ پر دس عدد نئے کمرہ جات تعمیر کئے ہیں، جس کو اندازاً دس سال کا عرصہ ہوتا ہے، جس پر وہ قابض و متصرف ہے، ان کمرہ جات پر میرے ورثاء کو حق نہیں ہے۔“

میرے نزدیک یہ صورت بیع یا ہبہ کی ہے جس میں متعین اراضی (محل وقوع اور پیمائش کے ساتھ) محروم حاجی عثمان صاحب نے اپنے ایک لڑکے عبدالغفار کو دے دی، جس پر وہ قابض و دخل ہو گئے، اگر ہبہ تسلیم کیا جائے تو بھی ہبہ تام ہو گیا، لہذا وہ شیء ملکیت عبدالغفار کی ہے، اس میں وارثوں کا حصہ نہیں ہوگا (۱)۔

۲- وصیت نامہ مذکور میں لکھا گیا ہے:

(۱) ”وتسم الہیۃ (بالقبض) الکامل“ (الدر المختار علی رد المحتار ۸/۳۹۳)۔

”چار عدد کمرہ جات روڈ سائڈ میں، میں نے اپنی بیوی مسماۃ فاطمہ بیگم صاحبہ کو مہر کے تحت دے دیا ہے، ان چار عدد کمرہ جات پر میرے ورثاء کو حق نہیں ہے۔“

میرے نزدیک یہ صورت بیع مقاصہ کی ہے، ہبہ کی نہیں ہے، بیع مقاصہ کا مطلب بعض واجب دین کوئی شی اس شخص کے ہاتھ فروخت کر دینا جس کا دین اس کے ذمہ واجب ہوتا ہے (۱)، شوہر پر بیوی کا مہر واجب ہے، اس مہر کے عوض جب وہ کوئی اراضی بیوی کو دے دیتا ہے اور اس طرح برابر برابر کر کے مہر کی ذمہ داری سے فارغ ہو جاتا ہے تو یہ بیع مقاصہ ہے، ہبہ نہیں (۲)، لہذا اس میں قبضہ کی شرط نہیں اور اگر حاجی محمد عثمان صاحب اس میں کرایہ پر لگانے اور کرایہ وصول کرنے کا کام کرتے بھی رہے ہیں تو سمجھا جائے گا کہ وہ اپنی بیوی کی طرف سے بہ حیثیت منتظم کاریہ فرائض ادا کرتے رہے ہیں، لہذا امکان مصرحہ وصیت نامہ چار عدد کمرہ جات جو روڈ سائڈ واقع ہیں، وہ مسماۃ فاطمہ بیگم کی ملکیت ہیں، اس پر ورثاء کا کوئی حق نہیں ہے۔

۳- حاجی عثمان مرحوم نے اپنی وفات سے تقریباً چھ ماہ پہلے ۵ بیٹوں کو نقد فی کس ڈھائی ہزار روپے اور ایک بیٹی کو ۵ ہزار روپے دیے اور ہر بیٹے کو مکانات کی تعمیر اور رہائش کے لئے ۵، ۵ پلاٹ اراضی دی جیسا کہ سوال میں مذکور ہے، یہ صورت ہبہ کی ہے، اگر مرحوم حاجی محمد عثمان نے یہ اراضی ۵ بیٹوں کو دے کر ان کو قبضہ دے دیا تو یہ ان ۵ بیٹوں کی ملک ہو گئی، اب یہ وارثین کے درمیان قابل تقسیم نہیں (۳)۔

۴- وصیت نامہ ہذا میں باقی ۲۳ کمرہ جات اور خالی زمین کے بارے میں یہ لکھا گیا ہے کہ اب رہا ۲۳ کمرہ جات مع خالی جگہ جو میرے قبضہ میں ہے، حسب ذیل ورثاء کے حق میں

(۱) ”المقاصۃ: إسقاط دین مطلوب لشخص علی غریبہ فی مقابله دین مطلوب (جاری) من ذلک الشخص لغریبہ“ (الموسوۃ الفقہیہ ۳۸/۳۹ بحوالہ مرشد الخیر ان مادہ ۲۲۳)۔

(۲) ”إذا کان للزوج علیہا دین فقال: احسبوا لہا نفقتہا منہ کان لہ ذلک لأن اکثرہا فی الباب أن تكون النفقة لہا دینا علیہ فإذا التقی الدینان تساویا قصاصاً، ألا تری أن لہ أن یقاص بمہرہا فالنفقة أولى“ (الموسوۃ للشرح ۵/۱۹ طبع دار الفکر بیروت، رد المحتار ۳/۲۴۰)۔

(۳) ”وتسم الہبۃ (بالقبض) الکامل“ (الدر المختار علی رد المحتار ۸/۴۹۳)۔

قابل تقسیم ہے، محمد اسماعیل صاحب، عبدالغفار صاحب، محمد ہارون صاحب میرے حقیقی لڑکے ہیں، امینہ بیگم زوجہ عبدالعزیز صاحب میری حقیقی لڑکی ہے، خدیجہ بیگم زوجہ محمد عمر صاحب، فاطمہ بیگم زوجہ حاجی نور محمد صاحب، یہ دونوں میری حقیقی بہنیں ہیں، ۲۳ عدد کمرہ جات میں دونوں بہنوں کا دسواں حصہ نکالنے کے بعد ۳ لڑکے، ایک لڑکی جن کے نام اوپر بتلائے گئے ہیں میرے مرنے کے بعد شرعی حصہ پائیں گے، دوسرے میرے دونوں لڑکے عبدالعزیز پارکچہ، مصطفیٰ پارکچہ ان دونوں لڑکوں کو میں کافی مالی مدد کرتا رہا، دونوں نے میرے خلاف بغاوت کر دی ہے اور مجھے مقدمہ بازی میں مبتلا بھی کئے ہیں، طرح طرح سے مجھے پریشان کئے اور ان دونوں نے مجھے روحانی صدمہ بھی پہنچایا، اس لئے میں ان دونوں کو جائداد سے محروم کر رہا ہوں، ان دونوں کو میری جائداد میں کسی قسم کا حق نہیں رہے گا، میرے مرنے کے بعد اگر میرے ورثاء ان کو جائداد میں حصہ دینا چاہیں تو وہ گنہگار رہیں گے۔

میرے نزدیک یہ وصیت ہے اور وارثوں کے حق میں وصیت صحیح نہیں ہے (۱)، البتہ دونوں حقیقی بہنیں غیر وارث ہیں، اس لئے ان کے حق میں وصیت جائز قرار پائے گی اور چونکہ وصیت میں متروکہ مال کا دسواں حصہ دونوں بہنوں کو دینے کی بات کہی گئی ہے جو متروکہ کے ایک تہائی سے کم ہے، اس لئے یہ وصیت جائز اور نافذ قرار پائے گی۔

لہذا کل متروکہ مذکورہ وصیت نامہ ہذا کا دسواں حصہ دونوں حقیقی بہنوں کو دیا جائے گا اور حاجی عثمان صاحب کا یہ لکھنا کہ ان کے دو لڑکوں عبدالعزیز پارکچہ اور محمد مصطفیٰ پارکچہ کو جائداد سے محروم کر دیا جائے، باطل قرار پائے گا، اس لئے کہ وراثت اللہ کی طرف سے دیا ہوا حق ہے، مورث کے عاق قرار دینے یا محروم کر دینے سے اللہ کے دیئے ہوئے حق پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، لہذا عبدالغفار کو دیئے ہوئے حصہ جس پر ہبہ مکمل ہو چکا ہے اور فاطمہ کو دین مہر میں دیئے ہوئے مکان، نیز آخر عمر میں پانچوں لڑکوں کو دیئے گئے پانچ پلاٹ کو چھوڑ کر جو کچھ بھی جائداد منقولہ یا غیر منقولہ یا نقد

(۱) ”عن أبی امامۃ الباہلی قال: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول فی خطبہ عام حجة الوداع: إن اللہ قد أعطی لكل ذی حق حقہ، فلا وصیۃ لوارث۔“ (سنن الترمذی باب ما جاء لا وصیۃ لوارث ۴۳۳/۴ طبع استنبول)۔

کی صورت میں حاجی محمد عثمان مرحوم نے چھوڑا اول اس میں سے ان کی تجہیز و تکفیل کے اخراجات ادا کئے جائیں گے، بعد ازاں جو کچھ ان پر دین ہوگا وہ ادا کیا جائے گا، اس کے بعد وصیت جو انہوں نے اپنی دونوں بہنوں کو کی ہے، وہ دی جائے گی، پھر جو کچھ بچ جائے اس کو ۸۸ حصوں پر تقسیم کر کے زوجہ کو $\frac{11}{88}$ حصہ یعنی دو آنہ اور پانچوں لڑکوں میں سے ہر ایک کو فی کس $\frac{13}{88}$ یعنی دو آنہ ۶ عدد صحیح $\frac{1}{11}$ پائی اور لڑکی کو $\frac{11}{88}$ یعنی ایک آنہ ۳ عدد صحیح $\frac{3}{11}$ پائی دیئے جائیں، حاجی محمد عثمان صاحب مرحوم کا لکھنا کہ اگر ان دونوں عاق شدہ لڑکوں کو حصہ دیا جائے تو حصہ دینے والے گنہگار ہوں گے، غلط ہے، بلکہ حصہ دینا واجب ہے اور موجب ثواب ہے، اس سلسلہ میں مرحوم کی وصیت باطل ہے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

جنوبی افریقہ میں بیوہ عورتوں کی رہائش کا مسئلہ (۱)

الجواب وبالله التوفیق

جنوبی افریقہ اور دوسرے وہ ممالک جو مغربی تہذیب سے متاثر ہیں، ان میں اجمالی

(۱) جنوری ۱۹۹۱ء میں حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نے ساؤتھ افریقہ کا سفر کیا، وہاں ان کے سامنے زبانی طور پر ایسے بہت سے مسائل پیش کئے گئے جو ساؤتھ افریقہ کے مخصوص حالات میں شرعی لحاظ سے حل طلب تھے، ان میں سے ایک سماجی مسئلہ بھی تھا جس کا تعلق بیوہ عورتوں کی رہائش سے تھا، چنانچہ صورت حال یہ ہے کہ مغربی تہذیب جس کی بنیاد خود غرضی پر ہے، وہاں بوڑھے والدین کے حالات نہایت افسوسناک ہیں اور یہ اولاد کی طرف سے انتہائی بے توقیری کے شکار رہتے ہیں، صورت حال یہ ہے کہ شوہر کے ترکہ میں اگر وہ صاحب اولاد ہو بیوی کا حصہ آٹھواں ہوتا ہے، چنانچہ بعض واقعات ایسے پیش آئے کہ والد کے انتقال کے بعد اولاد نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ اپنے حصہ کی قیمت لے کر گھر خالی کر دے، ایک بوڑھی بیوہ خاتون کے لئے اس میں جو دشواری ہے وہ محتاج اظہار نہیں، اس بنیاد پر بعض مردوں نے زندگی میں اپنی جائیداد بیوی کو بیہ کر دی، لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ بیوی ہی کا انتقال پہلے ہو گیا، اب شوہر کا حصہ اس کے ترکہ میں ایک چوتھائی رہ گیا تو یہی صورت حال اولاد کی طرف سے والد کو پیش آئی، یہ ایک ایسی تکلیف دہ صورت حال ہے جس سے جنوبی افریقہ اور مغربی ممالک میں لوگ دوچار ہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ ہندوستان اور مشرقی ممالک اب تک اس طرح کے اخلاقی بگاڑ سے محفوظ ہیں۔ قاضی صاحب نے اس مسئلہ پر ساؤتھ افریقہ کے زمانہ قیام ہی میں ایک تفصیلی تحریر تیار کی، جس میں اس سماجی مسئلہ کا فقہ مالکی کے مطابق شرعی حل تجویز فرمایا اور وہاں کے بہت سے علماء کو اکٹھا کر کے وہ تحریر سنائی، ہر نقطہ پر بحث و گفتگو کے بعد ان علماء نے اپنے دستخط ثبت کیے۔

یہ حضرت قاضی صاحب کی غایت احتیاط کی بات ہے کہ انہوں نے اپنی اس تحریر کو اس نوٹ کے ساتھ ہندوستان

خاندان (Joint Family) کا تصور عملاً ختم ہوتا جا رہا ہے، اور افراد خاندان کے درمیان باہمی رشتے کمزور، وتے جا رہے ہیں، جوان بیٹے شادی کے بعد عام طور پر والدین سے علیحدہ ہو کر اپنی رہائش الگ کر لیتے ہیں، والدین کی خدمت معاشرہ میں چند رکنی باتوں تک محدود رہ جاتی ہے، بلکہ اب تو اس طرح کے حالات آہستہ آہستہ ہندو پاک میں بھی خاص کر شہروں میں پیدا ہوتے جا رہے ہیں، غرض یہ کہ اولاد کی دنیا ہی الگ ہو جاتی ہے۔

بڑی دشواری اس وقت پیش آتی ہے جب باپ کا روبرو سے علیحدہ ہو کر ریٹائرڈ زندگی گزارنے لگے، یا باپ کا انتقال ہو جائے اور بیوہ ماں بوجھ بن کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو، ایسے حالات میں یہ بات عام طور پر دیکھی جا رہی ہے کہ اولاد باپ کے انتقال کے بعد دیگر املاک منقولہ وغیرہ منقولہ کے ساتھ ساتھ رہائشی مکان کو بھی تقسیم کرنے پر اصرار کرتی ہے، اور اس کے لئے آمادہ نہیں ہوتی کہ ماں کی زندگی تک رہائشی مکان ماں کے قبضہ و تصرف میں رہنے دے، عام طور پر جو مکانات غریب یا متوسط طبقہ کے پاس ہوتے ہیں، ان میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ $\frac{1}{8}$ حصہ ماں کو رہائش کے لئے کافی ہو، نتیجتاً اولاد کے اصرار پر مکان فروخت ہوتا ہے، اور مکان کی قیمت کا $\frac{1}{8}$ حصہ جو ماں کو ملتا ہے، وہ اسے متبادل رہائش فراہم کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتا، ایسا اوقات (خاص کر اگر اولاد مرحوم شوہر کی دوسری بیوی سے ہو) بیوہ کو اپنے گھر سے نکلنا پڑتا ہے اور اسے در در کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہے، ایسے بھی واقعات پیش آتے ہیں کہ اپنی اولاد نے ماں کو گھر سے نکال دیا اور یہ تو اکثر ہوتا ہے کہ ماں کو تنگ کیا جاتا ہے، بہو کی طرف سے اسے ذہنی اذیت پہنچائی جاتی ہے، اس کی عزت نفس (Dignity) مجروح ہوتی ہے، اور جس گھر میں وہ کبھی مالک مختار تھی، اسے وہاں سے خادمہ کی

کے مختلف علماء اور اصحاب افتاء کے پاس ان کی رائے حاصل کرنے کے لئے بھیجوا یا کہ "مسئلہ زیر بحث میں پہلا مقدمہ جنوبی افریقہ کے مسلم معاشرہ کا اس مشکل صورت حال سے دوچار ہونا ہے جس پر تمام ہی علماء اور دوسرے اصحاب نظر کا اتفاق ہے، بیوہ اور وصیت مسئلہ کا حال نہیں۔" "عمری" مطابق فقہ مالکی مسئلہ کا حل ہے، مسئلہ مجتہد فقہ ہے، سوال یہ ہے کہ اس مشکل صورت حال اور معاشرہ کو اس تکلیف سے نجات دلانے کے لئے "فقہ مالکی" کو معمول بنانا درست ہوگا یا نہیں؟" اس کے جواب میں بہت سی تحریریں آئیں، ان میں سے بعض تائیدی تھیں اور بعض میں اس موضوع کے نئے گوشے کھولے گئے ہیں، ان میں سے صرف ایک تحریر جو نہایت اہم اور قیمتی ہے حضرت قاضی صاحب کی تحریر کے ساتھ ہی پیش کی جا رہی ہے۔

حیثیت سے زندہ رہنا قبول کرنا پڑتا ہے، خاندانی رشتہ کے کمزور ہو جانے کے باعث وہ اپنے میکہ (والدین کے گھر جہاں اب اس کے بھائیوں کا راج ہے) میں بھی اپنے لئے گنجائش نہیں پائی اور نہ وہ بھائی کے گھر جا کر اپنی زندگی باعزت طور پر گزار سکتی ہے۔

جنوبی افریقہ اور اس جیسے دیگر ممالک میں تقریباً ہر طبقہ میں یہ شدید احساس پایا جاتا ہے کہ اس شکل کا کوئی ایسا شرعی حل نکلنا چاہئے جس کے ذریعہ اس کا اطمینان ہو کہ بیوہ خاتون باعزت زندگی گزار سکے گی اور ہر شخص یہ سوچتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری بیوی کا کیا ہوگا، اور کم از کم اس کی رہائش کا قابل اعتماد نظم اس کی زندگی میں ہونا چاہئے، تاکہ اس کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ کو کوئی گھر سے نہ نکال دے۔

پہلا امکانی حل ہبہ (Gift)

اس دشواری کے حل کا ایک راستہ تو یہ ہے کہ شوہر رہائشی مکان بیوی کو ہبہ کر دے یا اس کی آئندہ گزراوقات کے لئے کوئی ایسی جائیداد غیر منقولہ اس کو عطا کر دے جس کی آمدنی اس کی کفالت کے لئے کام آئے، لیکن اس میں دو دشواریاں ہیں:

پہلی تو یہ کہ جنوبی افریقہ کے قانون کی رو سے جائیداد غیر منقولہ کا ہبہ زبانی معتبر نہیں، اور اگر رجسٹرڈ وثیقہ کے ذریعہ اس جائیداد غیر منقولہ کی ملکیت زوجہ کی طرف منتقل کی جائے تو اس میں اخراجات غیر معمولی ہیں، جن کا برداشت کرنا ہر ایک کے لئے ممکن نہیں، رجسٹریشن کے اخراجات کے علاوہ ۱۵ فیصد مالیت شئی موہوبہ کا سرکار کو بطور عطیہ ٹیکس دینا پڑتا ہے، دوسری بڑی دشواری یہ ہے کہ اگر ہبہ کے بعد بیوی کا انتقال شوہر کی حیات میں ہو جائے تو پھر خود اس بوڑھے شوہر کو بیوی کے وارثوں کی طرف سے اسی برتاؤ سے دوچار ہونا پڑے گا، جس سے بچانے کے لئے اس نے وہ جائیداد بیوی کو ہبہ کیا تھا، اپنے بیٹوں سے بھی یہ امید نہیں کی جاتی ہے کہ وہ باپ کی زندگی تک اس جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ نہیں کریں گے، چہ جائیکہ اگر مرحومہ نے دوسرے شوہر سے اولاد چھوڑی ہو، یا کوئی اولاد نہیں ہونے کے باعث اس کے والدین اور بھائی یا دیگر عصبیات، مال متروکہ میں حصہ پانے کے مستحق ہوں، ایسی حالت میں اس شخص کا اپنے ہی گھر سے جو اس نے بیوی کو دے دیا تھا، نکالا جانا یقینی ہو جاتا ہے۔

دوسرا راستہ وصیت

جنوبی افریقہ کے قانون کے اعتبار سے "وصیت" معتبر ہے، اور قانونی وصیت کی صحت اور اس کے مفاد کے لئے نہ ایک تہائی (۱/۳) کی تحدید ہے اور نہ "غیر وارث" کی قید، اس لئے قانونی طور پر شوہر بیوی کے حق میں رہائشی مکان یا کسی دوسری جائیداد کی وصیت کر سکتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ شرعی بیوی کے حق میں جو اس کی وارث ہوگی، وصیت معتبر نہیں ہوگی، اور اگر وصیت ایک تہائی سے زیادہ کی ہو تو اس وجہ سے بھی شرعی وصیت ۱/۳ سے زیادہ جائیداد میں معتبر نہ ہوگی، وارث کے حق میں وصیت کا جائز نہیں ہونا، جماعتی مسئلہ ہے جس پر نص حدیث "فلا وصیۃ لوارث" (۱) دلیل ہے، لہذا "وصیت" اس دشواری کا حل نہیں ہو سکتی۔

تیسرا راستہ "تاحیات ہبہ"

تیسری صورت یہ ہے کہ شوہر بیوی کو اس کی حیات تک کے لئے مکان "ہبہ" کر دے، اس طرح کے معاملہ کا تذکرہ احادیث و کتب فقہ میں "عمری" اور "رقبی" کے عنوان کے تحت آتا ہے۔ امام کا سائی لکھتے ہیں: "اگر کوئی شخص کہے: "اعمر تک هذه الدار" تمہارے لئے مکان میں نے عمری کیا، یا صراحۃ یوں کہے: "یہ مکان میں نے تجھے اپنی زندگی تک کے لئے دیا" یا کہے: "تجھے یہ مکان میں نے تیری زندگی تک کے لئے دیا" یا یہ کہے: "یہ مکان تیری زندگی تک تیرا ہے، جب تو مر جائے تو یہ مجھے واپس مل جائے گا" یا یوں کہے: "یہ مکان تجھے اپنی عمر یا اپنی زندگی بھر کے لئے دیتا ہوں" یہ ساری صورتیں "ہبہ" کی ہیں اور یہ مکان اس شخص کی ملک ہو جائے گا جسے زندگی تک کے لئے دیا گیا ہے، اور اس کے مرنے کے بعد (واہب یا اس کے وارثوں کی طرف نہیں لوٹے گا بلکہ) اسی موہوب لہ کے وارثوں کی ملکیت ہوگا اور واہب کی طرف سے وقت اور مدت کا معین کرنا باطل ہو جائے گا (۲)۔

(۱) سنن الترمذی ۴۳۳ طبع استنبول۔

(۲) بدائع الصنائع للکاسانی، کتاب الہبۃ ۱۷۶-۱۷۷۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس صورت میں جبکہ ہبہ کرنے والا اس ہبہ کو اپنی یا موہوب لہ کی مدت تک محدود کرتا ہے، حنفیہ کے نزدیک یہ ہبہ نافذ ہوگا اور وقت کی تعیین باطل ہو جائے گی، امام کا سائی اس کی علت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں: ”یہ توقیت اس میں باطل ہو جائے گی کہ واہب کا یہ کہنا کہ یہ مکان میں نے تیرے لئے قرار دے دیا، یا یہ مکان تیرا ہے، اس کا مفاد یہ ہے کہ واہب نے فوری طور پر اس مکان کی ملکیت موہوب لہ کی طرف علی الاطلاق منتقل کر دی، پھر اس کا یہ کہنا کہ ”میری زندگی یا تیری زندگی تک کے لئے“ ایسا اضافہ ہے جس کا مفاد اس انتقال ملک کو وقت کے ساتھ مقید کرنا (Limitation of Time) ہے جس کا نتیجہ عقد ہبہ (Gift Contract) کے تقاضہ کو تبدیل کرنا ہے اور اسی طرح از روئے نص تملیک اعیان (کسی شی کی ملکیت منتقل کرنا) موقت (Time Bound) نہیں ہو سکتی، جیسے ”بیع“، پس ہبہ کو وقت کے ساتھ پابند کرنا ایسا تصرف (Disposal) ہے جو مقتضی عقد اور شرع کے خلاف ہے، اس لئے یہ شرط باطل ہوگی اور عقد صحیح رہے گا (۱)۔

دوسری صورت رقبی کی ہے، اس کا مفاد یہ ہے کہ ملکیت فوری طور پر منتقل نہیں کی جاتی، بلکہ انتقال ملک کو ایک خاص شرط کے ساتھ مشروط کر دیا جاتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص یہ کہے: ”ارقتک هذه الدار وجعلت هذه الدار لك رقبی“ یعنی اگر میں تجھ سے پہلے مر جاؤں تو یہ مکان تیری ملک ہوگا اور اگر تو مجھ سے پہلے مر جائے تو یہ میری ملک ہے (۲)۔

یعنی رقبہ کی صورت میں اصل انتقال ملک کو ہی ایک ایسی شرط پر معلق کر دیا گیا ہے، جس کا ہونا نہ ہونا محتمل ہے، لیکن عمری میں ملک فوری طور پر منتقل کر دی جاتی ہے، مگر اس کے امتداد کو خاص مدت تک محدود کر دیا جاتا ہے، پہلی صورت میں چونکہ اصل تملیک کو ایک محتمل شرط کے ساتھ مقید کر دیا جاتا ہے، اس لئے رقبی فریق ثانی کے لئے مفید ملک نہ ہوگا۔ ”والتملکات مما لا یحتمل التعلیق بالخطر“ (۳) اور عمری کی صورت میں ملک فوری طور پر فریق ثانی (موہوب لہ) کی طرف

(۱) بدائع الصنائع ۱/۶۷۶۔

(۲) بدائع الصنائع ۱/۶۷۶۔

(۳) بدائع الصنائع ۱/۶۷۶۔

منتقل ہو جائے گی اور فریق ثانی کی موت کے بعد واپسی کی شرط کا لعدم ہو جائے گی، اور دائمی ملکیت موہوب لہ کو حاصل ہو جائے گی، اور اس کی موت کے بعد جائداد موہوب لہ اس کے وارثوں میں تقسیم ہوگی، البتہ رقبی کی صورت میں اگر شی موہوب فریق ثانی کے قبضہ میں دے دی تو اسے عاریت قرار دیا جائے گا، فریق ثانی کو اس سے انتفاع کا حق حاصل ہوگا، اور فریق اول کو حق ہوگا جب چاہے واپس لے لے اور فریق اول کی موت کی صورت میں یہ اس کا متروکہ مال قرار پا کر اس کے وارثوں میں تقسیم ہوگا، ایک اور صورت ہے کہ صرف حق رہائش (Right of Residence) منتقل کیا جائے اور یوں کہے کہ اس مکان کا حق رہائش میں نے تجھے زندگی بھر کے لئے دیا، اس صورت میں ملک رقبہ منتقل نہیں کیا جاتا بلکہ صرف حق انتفاع منتقل کیا جاتا ہے اور بلا عوض حق انتفاع دینا عاریت ہے، اس لئے اس صورت میں بھی فریق اول جب چاہے مکان واپس کر سکتا ہے، اس کی موت کے بعد یہ مکان اس کے وارثوں کی طرف منتقل ہو جائے گا۔

ان ساری بحثوں کا حاصل یہ ہے:

(۱) عمری: واہب کا کوئی شی کسی کو ہبہ کر دینا اور اپنی یا اس کی زندگی تک اسے محدود کر دینا حنفیہ کے نزدیک جائز ہے، اور اس صورت میں ہمیشہ کے لئے اس شی کی ملکیت موہوب لہ کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، اور تا عمر یا تا حین حیات کی شرط باطل ہو جاتی ہے۔

(۲) رقبی: جس میں انتقال ملک نہیں ہوتا، محض بطور عاریت حق انتفاع فریق ثانی کو حاصل ہوتا ہے۔

(۳) سکنی: یعنی حق رہائش سے انتفاع (Right of Residence) فریق ثانی کو دینا یہ بھی عاریت کے حکم میں ہے۔

پس زیر بحث مسئلہ میں رقبی اور سکنی کی صورت میں اگر کوئی شخص اپنا رہائشی مکان اپنی بیوی کو دیتا ہے تو یہ محض عاریت ہوگا اور شوہر کی موت کے بعد اس کے وارثوں کو حق ہوگا کہ وہ مکان عورت سے واپس لے لیں اور ۸ حصہ پر عورت کو اکتفا کرنا پڑے، یعنی یہ موجودہ دشواری کا حل نہیں ہے، اور عمری کی صورت میں عورت کو حق ملکیت حاصل ہو جائے گی اور اس کا مسئلہ حل ہو جائے گا، لیکن جیسا کہ ہبہ کی صورت میں بتایا گیا اگر بیوی کی وفات شوہر کی زندگی میں ہوگئی تو یہ شی بیوی کے

وارثوں میں منتقل ہو جائے گی، اور شوہر کو انہیں دشواریوں سے گزرنا پڑ سکتا ہے، جن سے دو چار ہونے کا خطرہ بیوی کو تھا، عمری کے بارے میں آئندہ ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں کہ اس مسئلہ میں مختلف ائمہ مجتہدین کی رائے کیا ہے۔

اس سلسلہ میں علامہ ابن قدامہ الحنبلیؒ نے المغنی میں لکھا ہے: ”عمری اور رقبی، ہبہ کی دو قسمیں ہیں، اور ان ہر دو صورتوں میں بھی ہبہ کی عام صورتوں کی طرح ایجاب و قبول، قبضہ یا قبضہ کے قائم مقام کوئی عمل (جن کے نزدیک اس کا اعتبار ہے) ضروری ہے (۱)۔

عمری کی صورت یہ ہے کہ ہر کوئی شخص دوسرے سے کہے: ”اعمرتک دارى هذه“ (تجھے تاحین حیات میں نے اپنا یہ مکان دے دیا) یا یہ کہے: ”یہ مکان تیرا ہے میری زندگی بھر“ یا جب تک تو زندہ رہے“ وغیرہ (۲)۔

اور رقبی یہ ہے کہ کوئی شخص کسی سے کہے: ”ارقبتک هذه الدار“ یا یہ کہے: ”یہ مکان تیرا ہے تیری زندگی تک اس طرح کہ اگر تو مجھ سے پہلے مر جائے تو مکان مجھے واپس مل جائے گا اور میں تجھ سے پہلے مر جاؤں تو یہ مکان تیرا اور تیرے وارثوں کا ہوگا“ گویا وہ یوں کہتا ہے کہ یہ مکان اس شخص کا ہوگا جو بعد کو وفات پائے، اور دونوں ہی صورتیں اکثر اہل علم کی رائے میں جائز ہیں، اور بعضوں سے ایسا نقل کیا گیا کہ یہ صحیح نہیں ہے (۳)۔

عمری (حین حیات ہبہ) کی وجہ سے ملک معمر (دینے والے) سے معمر (جسے دیا گیا ہے) کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، یہ قول حضرت جابر بن عبد اللہ، ابن عمر، ابن عباس، شریح، مجاہد، طاہر، ثوری، شافعی اور اصحاب رائے (امام ابو حنیفہ) کا ہے، امام مالک اور لیث کا کہنا ہے کہ عمری: شی موہوب کی نہیں بلکہ اس کے منافع کی تملیک ہے، لہذا موہوب لہ (معمر) کو مکان کے استعمال اور

(۱) ”العمری والرقبی نوعان من الہیۃ یفتقران الی ما یفتقر الیہ سائر الہبات من الإیجاب والقبول والقبض او ما یقوم مقام ذلک عند من اعتبرہ“ (المغنی ۶/۳۳۳ طبع دار الفکر)۔

(۲) حوالہ سابق ۶/۳۳۳، ۳۳۵۔

(۳) المغنی لابن قدامہ ۶/۳۳۵۔

اس میں رہائش کا حق حاصل ہو جائے گا، اور جب موہوب لہ مر جائے گا تو واہب (معمر) کی طرف وہ ”شی موہوب“ لوٹ جائے گی (۱)۔

الشرح الکبیر علی متن المقنع میں لکھا ہے: ”اگر ہبہ کرنے والے نے یہ شرط لگا دی کہ موہوب لہ کے مرنے کے بعد یہ شی موہوب، ہبہ کرنے والے یا اس کے وارثوں کی طرف لوٹ جائے گی تو اس شرط کی صحت کے بارے میں دو رائیں ہیں، ایک تو یہ کہ عقد اور شرط دونوں صحیح ہیں، اور جب موہوب لہ مر جائے گا تو یہ شی واہب کی طرف لوٹ جائے گی، یہی قول قاسم بن محمد، یزید بن قسیط، امام زہری، ابوسلمہ بن عبد الرحمن، ابن ابی ذئب، امام مالک، امام ابو ثور اور داؤد کا ہے، اور امام شافعی کا بھی یہی ایک قول ہے: ”لما روی جابر قال إنما العمری التي أجاز رسول الله ﷺ أن يقول هي لك وللعقبك، فأما إذا قال هي لك ما عشت فإنها ترجع إلى صاحبها“ (۲)۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ شی موہوب لہ کی ملک ہو جائے گی، نیز اس کے وارثوں کی، اور شرط باطل ہو جائے گی، امام شافعی کا قول جدید اور امام ابو حنیفہ کا مسلک یہی ہے اور مذہب حنبلی میں بھی ظاہر مذہب یہی ہے (۳)۔

پس معلوم ہوا کہ حنفیہ، حنابلہ اور امام شافعی کے قول جدید کی رو سے شی موہوب بصورت عمری واہب کی طرف موہوب لہ کی موت کے بعد واپس نہیں ہوگی، لیکن امام مالک، لیث بن سعد، ابو ثور اور دوسرے بعض ائمہ کے نزدیک موہوب لہ کی موت کے بعد شی موہوب، واہب یا اس کے وارثوں کی طرف لوٹ جائے گی۔

امام ابن رشد نے یوں لکھا ہے: ”ہبہ منافع کی ایک قسم وہ ہے جس میں موہوب لہ کی حیات تک کی شرط ہوتی ہے، اسے عمری کہا جاتا ہے، اس بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں، ایک

(۱) المغنی لابن قدامہ ۶/۳۳۶۔

(۲) صحیح البخاری ۳/۱۳۳ طبع استنبول، صحیح مسلم ۲/۱۳۶ طبع استنبول۔

(۳) الشرح الکبیر علی متن المقنع لابن قدامہ ۶/۳۸۹، ۲۹۰۔

قول تو یہ ہے کہ یہ قطعی طور پر ہیہ ہے، اور شی موہوب کی ملکیت موہوب لہ کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، یہ قول امام شافعی، امام ابو حنیفہ، امام ثوری اور امام احمد بن حنبل، نیز دیگر علماء کا ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ اس صورت میں موہوب لہ کو (ملک رقبہ نہیں) بلکہ صرف منافع کی ملک حاصل ہوتی ہے، پس جب "موہوب لہ" مر جائے تو شی موہوب "واہب" کی طرف یا اس کے وارثوں کی طرف لوٹ جائے گی اور یہی قول امام مالک اور ان کے اصحاب کا ہے (۱)۔

اور فقہ مالکی کی کتاب "رسالہ ابن ابی زید القیر وانی" میں ہے: "من عمر رجلا حیاتہ دارا رجعت بعد موت الساکن ملکا لربہا، فإن مات المعمر يومئذ كانت لورثته يوم موته ملکا" (۲) (کسی شخص نے کسی شخص کو بطور "عمری" اس کی زندگی بھر کے لئے مکان دے دیا تو اس شخص کی موت کے بعد وہ مکان واہب کی طرف اس کے مملوک ہونے کی حیثیت سے واپس ہو جائے گا، پس اگر واہب کی موت عمری کرنے کے بعد ہو گئی تو موہوب لہ کی موت کے بعد یہ شی ان لوگوں کی ملک قرار پائے گی جو واہب کی موت کے دن ان کے وارث تھے)۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام مالک کے مسلک کے مطابق اگر شوہر اپنا رہائشی مکان اپنی زندگی میں بیوی کو حین حیات ہیہ کر دے یعنی یہ کہہ دے کہ یہ مکان میں نے تمہاری زندگی تک کے لئے دیا تو ایسی صورت میں شوہر کی موت کے بعد بھی وہ عورت جب تک زندہ رہے گی، اسے اس مکان میں رہائش کا حق ہوگا، اور شوہر کے وارثوں کو اس کا حق نہیں ہوگا کہ وہ اس مکان کی تقسیم کر کے اپنی وراثت وصول کر لیں، ہاں اس عورت کی وفات کے بعد (اگر شوہر زندہ ہو تو اس کی طرف، ورنہ شوہر کے وارثوں کی طرف وہ مکان لوٹ جائے گا، اور وراثت ان لوگوں میں جاری ہوگی جو شوہر کی وفات کے دن اس کے وارث تھے۔

(۱) بدایۃ المجتہد ۲/۲۳۸۔

(۲) اثر الدانی فی تقریب الحانی فی شرح رسالۃ ابن ابی زید القیر وانی ۵۵۸۔

مسئلہ مجتہد فیہ ہے

مذکور الصدر تفصیلی بحث اور ائمہ مجتہدین کے مسالک کے جائزے سے یہ امر واضح ہو گیا کہ حین حیاتی ہیہ جائز ہے اور موہوب لہ کی موت کے بعد واہب یا اس کے وارثوں کی طرف اس کی ملکیت کا واپس ہو جانا ایک مجتہد فیہ مسئلہ ہے، جس میں دلائل متعارض ہیں، اور اس کی وجہ سے ائمہ کی آرا مختلف ہیں۔

منصوص اور مجتہد فیہ میں فرق

اور یہ بھی متفق علیہ ہے کہ احکام منصوصہ اور احکام مجتہد فیہا کے مدارج مختلف ہیں، احکام منصوصہ سے عدول کسی حال میں جائز نہیں، لیکن احکام مجتہد فیہا میں خاص شرائط کے ساتھ بوقت ضرورت عدول جائز ہوگا۔

حالات کی تبدیلی کا اثر احکام پر

واضح رہے کہ شرع کے کچھ کلی قواعد ہیں جو تشریع کی بنیاد ہیں، ان کی رعایت بہر حال ضروری ہے، مثلاً شرع میں تخفیف و تیسیر، دفع ضرر اور دفع فساد کا اعتبار کیا گیا ہے "الدین یسر، الحرج مدفوع، الضرر یزال، إذا ضاق الأمر اتسع" (۱) ایسے قواعد ہیں جن کی رعایت احکام کے تعین کے وقت ضروری ہے۔

علامہ شامی نے لکھا ہے: "فکثیر من الأحكام یختلف باختلاف الزمان لتغیر (عرف) أهله أو لحدوث ضرورة أو فساد أهل الزمان بحيث لو بقی الحكم علی ما كان علیہ أولاً للزم منه المشقة والضرر بالناس ولخالف القواعد الشرعیة المبنیة علی التخفیف والتیسیر ودفع الضرر والفساد لبقاء العالم علی أتم نظام

(۱) الأشباه والنظائر لابن نجیم۔

واحسن احکام، ولہذا نری مشائخ المذہب خالفوا مانص علیہ المجتہد فی مواضع کثیرۃ بناء علی ما فی ذمتہم لعلہم بانہ لو کان فی ذمتہم لقال بما قالوا بہ أخذاً من قواعد مذہبہ" (۱)۔

اور ان سارے قواعد کی بنیاد آیات قرآنی پر ہے، مثلاً کوئی بھی نئی صورت حال ہو، فقہ اسلامی اس کا حکم کتاب و سنت سے مستنبط کرے گی، اس لئے کہ دین کامل ہو چکا، اور کمال دین کا تقاضا ہے کہ قیامت تک پیدا ہونے والے قضایا اور حوادث کا حل اس میں موجود ہو، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "الْیَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا" (۲)، دوسری طرف یہ بھی فرمایا: "فَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ" (۳)، "إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ" (۴)، "يُرِيدُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا" (۵)۔

ان ہی آیات سے فقہاء نے یہ قواعد مستنبط کیے ہیں، جن کا ذکر اوپر کیا گیا، اور شامی کی تصریح کے مطابق عرف کی تبدیلی، ضرورت کا پیدا ہو جانا اور اہل زمانہ میں فساد کا پیدا ہو جانا، جس کی وجہ سے حکم معروف پر عمل میں مشقت پیدا ہو جائے اور لوگوں کو ضرر پہنچے تو شرع کے عمومی قواعد کے پیش نظر آسانی پیدا کرنے اور ضرر و فساد کو دور کرنے کے لئے احکام میں تبدیلی ہوگی، اسی لئے مشائخ مذہب نے بسا اوقات مجتہد کی تصریحات کے خلاف فتویٰ دیا ہے، اور ہر حکم کی یہ تبدیلی دلائل و براہین کی ایک دوسرے پر ترجیح پر مبنی نہیں، بلکہ حالات اور زمانہ کی تبدیلی پر اس کی اساس ہے، کہ اگر موجودہ صورت حال اس زمانہ میں موجود ہوتی تو وہ مجتہدین بھی یہی رائے دیتے، اس طرح کے فتاویٰ کی بے شمار نظیریں فقہ کے ذخیرہ میں موجود ہیں۔

(۱) رسالہ ابن عابدین ۱۲۶۔

(۲) سورہ مائدہ ۳، (آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین کے پسند کیا)۔

(۳) سورہ حج ۷۸، (اللہ تعالیٰ نے دین کے مقابلہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی)۔

(۴) سورہ بقرہ ۱۸۵، (اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے، تم کو دشواری میں ڈالنا نہیں چاہتا)۔

(۵) سورہ نساء ۲۸، (اللہ تم سے بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہے اور انسان کو تو کمزوری پیدا کیا گیا ہے)۔

ماضی قریب میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ان بزرگوں میں سے گزرے ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے فقہ میں درک و بصیرت کے ساتھ ساتھ زمانہ شناسی، اپنے عہد کے حالات سے واقفیت، معاملات ناس سے باخبری کی دولت بے بہا عطا فرمائی تھی، حضرت تھانوی فرماتے ہیں: "یہ وہ وقت ہے کہ آج کل مشتبہ کو بھی حال کہا جائے، نہ کہ حلال کو بھی اس میں شبہات نکال کر حرام کر دیا جائے، اسی واسطے میں کہتا ہوں کہ فتویٰ میں تنگی نہ کرنی چاہئے، جائز تک رکھے تو غنیمت ہے۔۔۔۔۔ پر کہاں پابندی ہو سکتی ہے۔

اختلافی مسائل میں اگر ابتلاء عام ہو تو اس کو بھی جائز ہی بتلائے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ شریعت میں وسعت ہے اور (آج کل) معاملات بہت گندے ہو رہے ہیں، اگر مختلف فیہ امور کو حرام بتلایا جائے گا تو اگر اس پر کوئی عمل کرے گا تو اس کو تنگی ہوگی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شریعت کو تنگ سمجھنے لگے گا، اس لئے تنگی میں غلو نہیں کرنا چاہیے، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ وسعت ہونے سے اعتقاد درست ہوگا، کہ شریعت کیسی اچھی چیز ہے اور کیسی رحمت ہے" (۱)۔

اور حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب "مفتی اعظم پاکستان فرماتے ہیں: "چونکہ چاروں مذاہب بلاشبہ برحق ہیں، اور ہر ایک کے پاس دلائل موجود ہیں، اس لئے اگر مسلمانوں کی کوئی شدید اجتماعی ضرورت داعی ہو تو اس موقع پر کسی دوسرے مجتہد کے مسلک پر فتویٰ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

حضرت گنگوہی نے حضرت تھانوی کو وصیت کی تھی اور حضرت تھانوی نے ہم سے فرمایا کہ آج کل معاملات پیچیدہ ہو گئے ہیں، اور اس کی وجہ سے دیندار مسلمان تنگی کے شکار ہیں، اس لئے خاص طور سے بیع و شرا اور شرکت وغیرہ کے معاملات میں جہاں بلوی عام ہو، وہاں ائمہ اربعہ میں سے جس امام کے مذہب میں عام لوگوں کے لئے گنجائش کا پہلو ہو، اس کو فتویٰ کے لئے اختیار کرنا چاہئے" (۲)۔

بہر حال اگر ضرورت داعی ہے اور زمانہ کے بگاڑ کی وجہ سے عام مسلم معاشرہ دشواری میں مبتلا ہے اور اس دشواری کا حل ائمہ اربعہ میں سے کسی کے قول میں موجود ہو تو ایک امام کے قول سے

(۱) التبلیغ ۱۵، ۶۷، ۸۲۔

(۲) ابلاغ مفتی اعظم نمبر ۱۔

دوسرے امام کے قول کی طرف مقلدین کے لئے عدول کرنا اور اس پر فتویٰ دینا جائز ہی نہیں بلکہ عین مقتضائے قول شرعی ہے۔

مسئلہ زیر بحث کے بارے میں ٹرانسوال اور نٹال کے بہت سے ممتاز علماء، قانون دانوں، سماجی کارکنوں اور اہل دانش سے میری باتیں ہوئیں، یہ سبھی حضرات صورت حال کی نزاکت، معاشرہ کی دشواریوں سے متعلق اور اس مسئلہ میں لوگوں کے عام ابتلاء پر اتفاق رکھتے ہیں اور طرح طرح کی ترکیبیں اس شکل سے نکلنے کی سوچتے رہتے ہیں، یا پھر عوام الناس سرکاری قانون کے مطابق اپنی بیوی کے حق میں وصیت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، جو شرعی نادرست اور خلاف نص و اجماع ہے۔

ان حالات میں اس حقیر کے نزدیک معاشرہ کو اس شدید مشقت اور مشکل و دشوار گزار حالات سے نکالنے کے لئے اس ابتلاء عام کی صورت میں فقہ مالکی کے مطابق فتویٰ دینا جائز ہوگا کہ ”شوہر ہائشی مکان بیوی کو اس شرط کے ساتھ دے دے کہ یہ مکان بیوی کی زندگی بھر اس کے قبضے و تصرف میں رہے گا اور وہ اس سے مستفید ہوتی رہے گی، اور اس کی موت کے بعد اگر خود شوہر زندہ ہو تو وہ مکان اس کی طرف لوٹ آئے گا اور اگر وہ بیوی کی وفات سے پہلے مر جائے تو شوہر کے وارثوں میں جو اس کی وفات کے وقت موجود تھے بطور متروکہ بحساب سہام شرعی تقسیم ہو جائے گا۔“

اس پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ:

۱- عمری (حیثیاتی ہے) جس کی رو سے کوئی شوہر اپنی زوجہ کو اس کی زندگی بھر کے لئے کوئی شے مثلاً رہائشی مکان دے کے جائے۔

۲- موہوب لہا (زوجہ) اپنی زندگی بھر جس طرح چاہے ”شی موہوب“ سے منتفع ہوتی رہے گی، خود شوہر کو یا اس کی وفات کے بعد اس کے وارثوں کو اس پر حق اعتراض نہیں ہوگا، لیکن زوجہ اس مکان کو فروخت نہیں کر سکتی۔

۳- اگر زوجہ (موہوب لہا) شوہر کی زندگی میں فوت کر جائے تو یہ شی موہوب شوہر کو واپس

مل جائے گی اور زوجہ کے وارثوں کو اس پر کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔

۴- اگر شوہر کا انتقال ہو جائے تو زوجہ (موہوب لہا) جب تک زندہ ہے، شوہر کے وارثوں کو اس شی موہوب پر کوئی حق انتفاع حاصل نہیں ہوگا، اور نہ وہ اسے فروخت کر سکتے ہیں، نہ کوئی اور تصرف کر سکتے ہیں۔

۵- زوجہ کے انتقال کے بعد یہ شی موہوب زوج کے ان وارثوں میں تقسیم ہوگی جو بوقت وفات زوج اس کے وارث تھے، اگر ان میں سے کوئی وارث درمیانی مدت میں انتقال کر گیا ہو تو اس کا شرعی حصہ اس کے وارثوں میں تقسیم ہوگا، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆

مخدوم و مکرم جناب مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب دامت برکاتہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جنوبی افریقہ کے مسلم معاشرہ کو درپیش ایک سماجی مشکل کو حل کرنے سے متعلق آپ کی تحریر موصول ہوئی، آپ کی تحریر کو غور سے پڑھنے اور کتب فقہ اسلامی کی جانب مراجعت کے بعد اپنے خیالات ذیل میں درج کرتا ہوں:

۱- جنوبی افریقہ اور دیگر مغرب زدہ ممالک میں متنوع معاشرتی پیچیدگیوں کا پیدا ہونا حیرت انگیز نہیں ہے، کوئی سماج جب فطری سادگی اور بنیادی انسانی اقدار سے دور ہو جاتا ہے تو غیر فطری اور مصنوعی تہذیب و معاشرت کے نتیجے میں طرح طرح کی مشکلات پیش آتی ہیں، ان حالات میں علماء، ارباب اصلاح اور اصحاب فقہ و افتاء کی دوہری ذمہ داری ہوتی ہے، پہلی ذمہ داری تو یہ ہے کہ سماج کو فطری سادگی اور بنیادی انسانی اقدار کی طرف واپس لانے کی انتھک کوشش کی جائے، سماج کا وہ روگ دور کرنے کی پوری سعی کی جائے، جس کے نتیجے میں طرح طرح کی پیچیدگیاں جنم لے رہی ہیں اور معاشرہ انت نئی الجھنوں میں پھنستا جا رہا ہے، خونی اور خاندانی رشتے کا اتنا کمزور ہو جانا کہ بیٹوں کو ماں باپ کی بنیادی ضروریات کا خیال نہ ہو، اور بعض حالات میں اولاد کے موجود ہوتے ہوئے بیوہ ماں کو دردر کی ٹھوکریں کھانا پڑے، بڑے خطرے کی علامت ہے،

خاندانی نظام کا بکھراؤ کسی سماج کے لئے اچھی علامت نہیں ہے، اس بارے میں جنوبی افریقہ کے علماء، مصلحین اور اصحاب دانش کو جنگی پیمانے پر جدوجہد کرنی چاہئے، خدا کرے اس سلسلے میں جنوبی افریقہ کے علماء اور مصلحین فکر مند اور سرگرم عمل ہوں۔

دوسری ذمہ داری جو خصوصاً علماء اور اصحاب افتاء پر عائد ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ انسانی اور اسلامی اقدار سے منحرف سماج میں جو مشکلات پیدا ہو رہی ہیں شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے ان کا حل تلاش کریں اور جب تک کہ سماج کی اصلاح نہیں ہو جاتی اس وقت تک کے لئے دفع مضرت، رفع حرج وغیرہ کے اصولوں کی روشنی میں مشکلات سے کراہتے ہوئے سماج کے لئے سیر وسہولت پیدا کریں، اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں کو کامیاب اور قبول کرے کہ آپ نے جنوبی افریقہ کے علماء اور اصحاب دانش کی تحریک پر اس سلسلے میں پہل کی اور شریعت مطہرہ کی روشنی میں ایک پیچیدہ سماجی مسئلہ کو حل کرنے کی سعی فرمائی۔

۲- جنوبی افریقہ کی بیوہ عورتوں کو رہائشی مکان کی جو دشواری پیش آتی ہے، اس کی حیثیت شاذ و نادر واقعات کی ہے یا اس نے ایک سماجی مشکل کی صورت اختیار کر لی ہے، یعنی ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں، اس کے بارے میں جنوبی افریقہ کے علماء اور متدین افراد ہی کا بیان فیصلہ کن مانا جائے گا، آپ نے تحریر فرمایا ہے ”مسئلہ زیر بحث میں پہلا مقدمہ جنوبی افریقہ کے مسلم معاشرہ کا اس مشکل صورت حال سے دوچار ہونا ہے، اس پر تمام ہی علماء اور دوسرے اصحاب نظر کا اتفاق ہے“ میرے خیال میں آپ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا جانا اور جنوبی افریقہ کے معتد بہ علماء کا اس کے بارے میں فکر مند ہونا اور غور و خوض کرنا خود اس بات کی علامت ہے کہ یہ مسئلہ سماجی مسئلہ بن چکا ہے اور اس سطح پر آ گیا ہے کہ شریعت مطہرہ کی روشنی میں اس کا کوئی حل تلاش کرنا اصحاب افتاء کی ذمہ داری ہے، فقہ حنفی کے دائرے میں رہتے ہوئے اگر اس مشکل کا حل ممکن نہ ہو تو خود حنفی اصول افتاء کی روشنی میں ضروری ہے کہ دوسرے فقہاء اسلام کے اقوال و مذاہب میں اس کا حل تلاش کیا جائے۔

۳- مجھے اس سے اتفاق ہے کہ بیوہ اور وصیت اس مشکل کا حل نہیں ہیں اور ان دونوں کو

اختیار کرنے میں شرعی قباحت یا ممانعت دشواری ہے۔

۳- آپ کی رائے میں فقہ مالکی کے مطابق عمری (تاحیات ہبہ) اس مسئلے کا حل ہے، مجھے بھی آپ کی رائے سے بڑی حد تک اتفاق ہے، اس میں مجھے کوئی شبہ نہیں کہ فقہ مالکی کے مطابق عمری کو اختیار کر لینے میں اگر یہ مشکل حل ہو جاتی ہو تو خود حنفی اصول افتاء کا تقاضا ہے کہ فقہ مالکی کو اس خاص مسئلہ میں اختیار کر لیا جائے، لیکن اس سلسلے میں میری چند معروضات ہیں ان پر غور کیا جائے، تاکہ پوری تنقیح و بصیرت کے ساتھ زیر بحث مسئلہ میں فیصلہ کیا جاسکے۔

(الف) یہ بات محتاج بیان نہیں کہ فقہ مالکی سے اگر عمری کا مسئلہ اختیار کیا جائے تو فقہ مالکی کی شرائط و تفصیلات کے ساتھ اختیار کیا جائے گا، فقہ مالکی کے مطابق عمری ہبہ ہی کی ایک قسم ہے فرق صرف اتنا ہے کہ عمری عین مال کے بجائے منافع مال کا ہبہ ہے، اسی لئے کتب مالکیہ میں عمری کو ہبہ کی ایک قسم ہی کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو بدایۃ المجتہد جلد ثانی، کتاب الہبات۔

جب عمری ہبہ کی ایک قسم ہے تو اس میں وہی تمام شرطیں ملحوظ ہوں گی جن کا ہبہ میں وجود ضروری ہے، علامہ ابن قدامہ حنفی نے لکھا ہے: ”والعمری والرقبی نوعان من الہبۃ یفتقران الی ما یفتقر الیہ سائر الہبات من الإیجاب والقبول والقبض أو ما یقوم مقام ذلک عند من اعتبرہ“ (۱) (عمری اور رقبی ہبہ کی دو قسمیں ہیں، ان دونوں میں ان تمام چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کی تمام ہبات میں ضرورت ہوتی ہے یعنی ایجاب و قبول اور قبضہ یا قبضہ کے قائم مقام کوئی چیز، ان کے نزدیک جو اسے معتبر مانتے ہیں)۔

مالکیہ کے نزدیک قبضہ اگرچہ صحت ہبہ اور لزوم ہبہ کے لئے شرط نہیں لیکن تمامیت ہبہ کے لئے شرط ہے، علامہ ابن رشد ائمہ کے اقوال ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”إن العلماء اختلفوا هل القبض شرط فی صحة العقد أم لا؟ فاتفق الثوری والشافعی وأبو حنیفۃ أن من شرط صحة الہبۃ القبض وأنه إذا لم یقبض لم یلزم الواهب، وقال مالک: یسعد بالقبول ویجبر علی القبض کالبیع سواء، فإن تأنی الموهوب له عن طلب

القبض حتی أفلس الواهب أو مرض بطلت الہیۃ“ (۱) (علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا قبضہ عقد ہبہ کی صحت کے لئے شرط ہے یا نہیں؟ ثوری، شافعی، ابو حنیفہ کا اتفاق ہے کہ صحت ہبہ کی ایک شرط قبضہ ہے اور اگر قبضہ نہیں کیا تو ہبہ کرنے والے کے ذمہ ہبہ لازم نہیں ہوا، مالک نے فرمایا: ہبہ قول سے منعقد ہو جاتا ہے اور اسے بیع کی طرح قبضہ پر مجبور کیا جائے گا، اگر موهوب نے قبضہ کا مطالبہ کرنے میں سستی کی یہاں تک کہ ہبہ کرنے والا مفلس ہو گیا یا مرض الموت میں مبتلا ہو گیا تو ہبہ باطل ہو گیا۔

احمد الدردیر مالکی الشرح الکبیر میں لکھتے ہیں: ”(وحیز) الشئ الموهوب ستم الہیۃ أي تحصل الحیازۃ عن الواهب التي هي شرط في تمامها (وإن بلا إذن) من الواهب ولا يشترط التحویز... (وبطلت) الہیۃ (إن تأخر) حوزها (للدین محیط)... (أو وهب لسان وحاز)... (أو جن) الواهب (أو مرض) بغير جنون (واتصلا بموته)“ (۲) (اور ہبہ کی گئی چیز پر قبضہ کر لیا گیا، تاکہ ہبہ مکمل ہو جائے، یعنی ہبہ کرنے والے کی جانب سے قبضہ ہو جائے جو ہبہ کے مکمل ہونے کے لئے شرط ہے، اگرچہ واہب کی اجازت کے بغیر ہو، قبضہ دلانا شرط نہیں ہے، اور ہبہ باطل ہو گیا اگر اس کے قبضہ میں تاخیر ہوئی احاطہ کرنے والے دین کی وجہ سے... یا دوسرے کو ہبہ کر دیا اور اس نے قبضہ کر لیا یا ہبہ کرنے والے کو جنون لاحق ہو گیا یا جنون کے علاوہ مرض لاحق ہو گیا اور دونوں چیزیں اس کی وفات تک برقرار ہیں۔

میاں بیوی میں سے اگر ایک دوسرے کو رہائشی مکان ہبہ کرتا ہے، اس سلسلے میں مالکیہ کے یہاں بڑی صراحت ملتی ہے، اس کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، اس سلسلے کی کچھ تفصیل الشرح الکبیر اور حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر سے نقل کی جاتی ہے: ”(و) صح (ہبۃ أحد الزوجین للآخر متاعا) وإن لم ترفع ید الواهب عنه للضرورة والمراد بالمتاع ما عدا دار السكنی

(۱) بدایۃ المجتہد ۲/۳۲۹۔

(۲) الشرح الکبیر مع حاشیۃ الدسوقی ۵/۳۹۶ ۳۹۹ طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت۔

فی شمل الخادم وغيره وأما دار السكنی ففيها تفصیل أشار له بقوله وصحت (ہبۃ زوجۃ دار سکناھا لزوجھا لا العکس) وهو ہبۃ الزوج دار سکناھ لزوجتھ فلا یصح لعدم الحوز لأن السكنی للرجل لا للمرأة فإنھا تبع له“ (۱) (میاں بیوی میں سے ایک کا دوسرے کو کوئی سامان ہبہ کرنا صحیح ہے، اگرچہ ہبہ کرنے والے کا قبضہ اس سے ختم نہ ہوا ہو، ضرورت کی وجہ سے اور متاع (سامان) سے مراد رہائشی مکان کے علاوہ دوسری چیزیں ہیں، لہذا اس میں خادم وغیرہ بھی شامل ہوں گے، رہائشی مکان کے بارے میں تفصیل ہے جس کی طرف مصنف نے اپنے اس قول سے اشارہ کیا ہے، کہ بیوی کا اپنا رہائشی مکان اپنے شوہر کو ہبہ کرنا درست ہے، اس کے برعکس درست نہیں، یعنی شوہر کا اپنا رہائشی مکان بیوی کو ہبہ کرنا درست نہیں، کیونکہ اس میں قبضہ نہیں پایا جا رہا ہے، کیونکہ رہائش مرد کی مانی جاتی ہے نہ کہ عورت کی، کیونکہ بیوی شوہر کے تابع ہے۔

”قوله لا (العکس) وهو ہبۃ الزوج لزوجتھ دار سکناھ فلا یصح إذ استمر ساکناً فیھا معها حتی مات“ (۲) (ان کے قول ”لا العکس“ کا مفہوم یہ ہے کہ شوہر کا اپنی بیوی کو اپنا رہائشی مکان ہبہ کرنا صحیح نہیں ہے جبکہ شوہر اپنی وفات تک بیوی کے ہمراہ اسی مکان میں رہائش رکھے۔

فقہ مالکی کی مشہور کتاب الخرش علی مختصر سیدی خلیل جزء ”۷“ میں بھی اسی طرح کی تصریحات موجود ہیں۔

مجھے اندیشہ ہے کہ اگر فقہ مالکی سے عمری کی ضروری تفصیلات مرتب کیے بغیر زیر بحث سماجی مشکل کو حل کرنے کے لئے فقہ مالکی سے عمری کو اختیار کرنے کا فتویٰ دیا گیا، تو اس پر جو عمل کیا جائے گا وہ فقہ مالکی کے مطابق نہیں ہوگا، عمری کی کارروائی ایک کاغذی کارروائی ہو کر رہ جائے گی، جن ممالک میں رہائشی مکانات کی شدید دشواری ہوتی ہے۔ (غالباً جنوبی افریقہ میں بھی ایسا ہو) ان میں شوہر کا بیوی کی حیات تک اپنے رہائشی مکان سے کامل طور پر دستبردار ہو جانا آسان بات نہیں ہے، کیونکہ نیا

(۱) الشرح الکبیر مع حاشیۃ الدسوقی ۵/۵۰۳، ۵۰۵ طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت۔

(۲) تقریرات علیش مع حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر ۵/۵۰۵ طبع بیروت۔

رہائشی مکان مہیا کرنا چنداں آسان نہیں، اور اگر عمری کے بعد بھی حسب دستور میان بیوی اسی مکان میں رہتے رہے تو میرے خیال میں فقہ مالکی کے مطابق عمری کی تکمیل نہیں ہوئی، اور شوہر کے مرض الموت میں گرفتار ہوتے ہی عمری باطل ہو گیا، لہذا جس سماجی مشکل کا حل کرنے کے لئے فقہ مالکی سے عمری کا مسئلہ اختیار کیا جانا زیر غور ہے وہ حل نہ ہو پائے گا۔

میری رائے یہ ہے کہ فقہ مالکی کی مستند کتابوں سے عمری کی ضروری شرائط و تفصیلات یکجا کئے جائیں اور فتویٰ دیتے وقت ان شرائط و قیود کی بھی صراحت کر دی جائے تاکہ جو لوگ بیوی کے لئے رہائشی مکان عمری کرنا چاہیں وہ ان شرائط و تفصیلات کا بھی لحاظ رکھیں، اور ان کے مطابق عمل کریں۔

(ب) اگر شوہر نے اپنا رہائشی مکان بیوی کو بطور عمری ہبہ کر دیا تو ظاہر بات ہے کہ بیوی کی حیات تک (خواہ دونوں کا نکاح باقی رہے یا ختم ہو جائے) وہ مکان بیوی ہی کے قبضہ و تصرف میں رہے گا، بیوی اسے کرایہ پر بھی اٹھا سکتی ہے، کسی دوسرے کو عاریتہ رہائش کے لئے بھی دے سکتی ہے، سوال یہ ہے کہ کیا بیوی کے مستقبل کے لئے فکر مند شوہر اپنے رہائشی مکان سے عملاً اس حد تک بے دخلی پر آمادہ ہوں گے اور کیا ان کے لئے دوسری رہائشی مکان کی فراہمی جنوبی افریقہ جیسے ملک میں آسان ہوگی؟ بطور عمری شوہر کا مکان ملنے کے بعد ایسا ممکن تو ہے کہ شوہر کچھ دنوں کے لئے الگ رہائش کا بندوبست کر لے اور مکان موہو بہ کو مکمل طور پر بیوی کے قبضہ و تصرف میں دے دے، پھر کچھ دنوں کے بعد بیوی بخوشی شوہر کو اس مکان میں رہنے کی اجازت دے دے، لیکن جنوبی افریقہ کا سماج جو دن بدن مغربیت کے اثر سے تعاون، ہمدردی اور صلہ رحمی کے جذبات سے عاری ہوتا جا رہا ہے، وہاں کی خواتین سے کیا ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ مکان پر مکمل قبضہ و دخل ملنے کے بعد اسے کرایہ پر اٹھا کر جو زبردست مادی منفعت حاصل کی جاسکتی ہے اس سے وہ بخوشی دست بردار ہونے کو تیار ہو جائیں گی؟ زیادہ دشواری اس وقت پیش آئے گی جب خدا نخواستہ دونوں کے تعلقات خراب ہوں گے اور طلاق کی نوبت آئے گی، ظاہر بات ہے کہ طلاق کے بعد وہ مطلقہ بیوی مکان موہو بہ کے منافع کی اسی طرح حقدار رہے گی جس طرح نکاح

کے وقت بھی، اور اس کی زندگی بھر شرعاً اسی کو قبضہ و تصرف حاصل رہے گا۔

میرے یہ اندیشے کس درجہ قابل لحاظ ہیں اس کا فیصلہ غالباً جنوبی افریقہ کے علماء اور اصحاب دانش، نیز وہاں کی سماجی زندگی کا تجربہ رکھنے والے افراد سے تبادلہ خیال کے بعد ہی کیا جاسکے گا، اس لئے میری رائے یہ ہے کہ فقہ مالکی سے عمری کو اختیار کرنے کے ممکنہ اثرات و نتائج کے بارے میں دوبارہ غور و خوض کیا جائے، اور اگر جنوبی افریقہ کے اصحاب فقہ و دانش اور ماہرین سماجیات اس بات پر مطمئن ہوں کہ عمری والا حل اختیار کرنے میں دوسری سنگین پیچیدگیاں جنم نہیں لیں گی تو فقہ مالکی سے عمری کا مسئلہ اختیار کر کے جنوبی افریقہ کے مسلم معاشرہ کی زیر بحث سماجی مشکل دور کر دی جائے۔

کتاب الاضحیہ

دم کٹی ہوئی بھیڑ کی قربانی ہو سکتی ہے؟

مخدوم و مکرم حضرت مفتی قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب
دو سوال برائے استفتاء پیش خدمت ہے، جواب مرحمت فرما کر شکر گزاری کا
موقع عنایت فرمائیں گے۔

ہمارے دیار میں بھیڑ ہی قربانی میں ذبح ہوتے ہیں، بکرے اور گائے کا رواج
بہت کم ہے، یہاں بھیڑ کی پرورش اور کاروبار گوروں کے ہاتھ میں ہے، حفظان
صحت کے پیش نظر بھیڑ کی دم چھوٹی عمر میں کاٹ دیتے ہیں، وجہ یہ بیان کرتے
ہیں کہ دم نہ کاٹنے کی صورت میں دم پاخانہ کے مقام پر چپک جاتی ہے، پھر جانور
کو پاخانہ کرتے وقت تکلیف ہوتی ہے، وہاں پر یعنی پاخانہ کے مقام پر کیڑے
پیدا ہوتے ہیں اور وہ کلیجے اور جگر میں پہنچتے ہی وہ کلیجہ انتہائی مضر صحت ہوتا ہے اور
جانور کمزور ہو جاتا ہے، ہمارے یہاں مذبح میں ذبح کے بعد ہر جانور کا ڈاکٹری
معائنہ ہوتا ہے۔ اگر کلیجہ میں کیڑے پائے گئے تو اس کلیجے کو آگ کی نذر کر کے
جلادیتے ہیں۔ اور وہ کیڑا اتنا جاندار ہوتا ہے کہ کھولتے ہوئے پانی میں کلیجے کو ابالا
جائے تب بھی نہیں مارتا۔ اور پھر دم کاٹنے سے جس طرح خسی کرنے سے فربہ
ہوتا ہے، دم کاٹنے کی صورت میں بھی جانور فربہ ہوتا ہے، دم والے جانور بھی ملتے
ہیں، مگر بہت کم اور بکرے تو بہت ہی کم ملتے ہیں، اور بہت گراں۔ ان حالات
میں اگر وقت پر دم بریدہ بھیڑ ہی ملیں تو اس کی قربانی ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق

جب طبی تجربات سے یہ بات ثابت ہے کہ بھیڑ کو امراض سے بچانے کے لئے اس کی دم

کاٹ دینا ضروری ہے، ورنہ بھیڑ امراض کا شکار ہو کر نہ صرف یہ کہ انتہائی لاغر و نحیف ہو جائے گا، بلکہ
اس کے گوشت کا استعمال انسانی صحت کے لئے بھی مضر ہو سکتا ہے تو ایسی صورت میں یہ دم کاٹنا، بھیڑ
کو عیب دار بنانا نہیں بلکہ اس کو عیب سے بچانا ہے، اس لئے دم بریدہ بھیڑ کی قربانی جائز و درست
ہے، دم کاٹ دینے سے بھیڑ عیب دار نہیں ہوا (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

نماز عید سے قبل دی ہوئی قربانی کا حکم

کیا فرماتے ہیں مفتیان دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز عید الاضحیٰ کے قبل
قربانی کرنا جائز ہے کہ نہیں، ہم لوگوں کے درمیان اختلاف ہے کہ بعد نماز قربانی
کرنا چاہئے، قبل نماز قربانی جائز نہیں ہے، مہربانی فرما کر جواب باثواب سے
مطلع فرمائیں کہ قبل نماز قربانی کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق

جہاں عید الاضحیٰ کی نماز ہوتی ہے وہاں نماز سے قبل قربانی کرنا درست نہیں ہے، لیکن جہاں
عید کی نماز نہیں ہوتی ہے وہاں نماز سے قبل بھی قربانی کر سکتے ہیں (۲)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱) "بوضعی بالجماء والخصی والثولاء" (الدر المختار علی رد المحتار ۹/۳۶۷)، الفتاویٰ البندیہ ۵/۲۹۷۔

(۲) "ووقت الاضحیہ یدخل بطلوع الفجر من یوم النحر، إلا أنه لا يجوز لأهل الأمصار الذبح

حتى یصلی الإمام العید، فاما أهل السواد فیدبحون بعد الفجر والأصل فيه قوله عليه

السلام "من ذبح شاة قبل الصلاة فلیعد ذبیحته" (صحیح البخاری، کتاب الاضاحی ۶/۲۳۸ طبع

استنبول) غیر أن هذا الشرط فی حق من علیه الصلاة وهو المصري دون أهل السواد" (فتح

القدیر ۹/۵۲۵، ۵۲۶ طبع بیروت)، رد المحتار ۹/۳۶۰۔

کتاب الاطعمة

خرگوش کی حلت

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں:
شریعت اسلامی میں خرگوش حلال ہے، اس کے حلال ہونے کی وجہ کیا ہے؟ جب کہ اسی قبیل کے دوسرے جانور حرام قرار دیئے گئے ہیں اور جدید سائنسی تحقیقات کی رو سے مندرجہ ذیل نکات خرگوش کو حلال قرار دیئے جانے کے خلاف جاتے ہیں۔

(۱) خرگوش "بلی" کے قبیل کا جانور ہے، (۲) جگالی نہیں کرتا، (۳) اسے حیض کا خون آتا ہے، (۴) اسے پستان بھی ہوتا ہے، (۵) پچھے کھڑ نہیں ہوتے، بلکہ ناخن ہوتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔
براہ کرم قرآن و حدیث اور فقہ کی روشنی میں جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب وبالله التوفیق

حلت و حرمت کا تعلق حکم الہی سے ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: "أُحِلَّتْ لَكُم بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَا يُتْلَى عَلَيْكُمْ" (۱) اور حلال کئے گئے تمہارے لئے چوپائے موسیٰ سوائے ان کے جو آگے تمہیں بتائے جا رہے ہیں۔ اور چند آیات کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخَنَازِيرِ" الخ الآية (۲) (تم پر حرام کیا گیا مردار، خون اور لحم خنزیر (وغیرہ حسب تفصیل آیت))، پس حلت و حرمت کا اصل تعلق حکم الہی سے ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام حکمت سے خالی نہیں، شریعت نے طیبات (پاک صاف چیزوں) کو

(۱) سورہ مائدہ ۱/۱۰

(۲) سورہ مائدہ ۳/۳

انسان کے لئے حلال کیا ہے، "بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ" موسیٰ چوپائے جو پاک صاف انسانی فطرت اور جسمانی تقاضوں کے موافق ہیں، انہیں حلال کیا گیا ہے، جہاں تک خرگوش کا تعلق ہے، اس کا حلال ہونا صریح و صحیح حدیث نبی ﷺ سے ثابت ہے۔

صاحب ہدایہ نے لکھا ہے: "ولا بأس بأكل الأرنب لأن النبي عليه السلام أكل منه حين أهدى إليه مشوياً وأمر أصحابه رضي الله عنهم بالأكل منه" (۱) (اور خرگوش کھانے میں کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ نبی علیہ السلام نے خود کھایا جب انہیں ہدیہ میں خرگوش کا بھنا ہوا گوشت پیش کیا گیا اور اپنے اصحاب کو بھی کھانے کا حکم دیا) (۲)۔

اور عینی نے قدوری کا قول نقل کیا ہے: "ولا خلاف فيه لأحد من العلماء" (۱) اس کے جواز میں علماء میں سے کسی کا اختلاف نہیں ہے (اور کرنی نے بھی اپنی مختصر میں لکھا ہے: "سبھی علماء کی رائے میں خرگوش کے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے" (۳)، نبی کریم ﷺ کا خرگوش کے گوشت کا ہدیہ قبول کرنا اور اسے کھانا بخاری کی روایت کتاب الہیہ سے (بہ روایت ہشام بن زید عن انس بن مالک) ثابت ہے (۴)، اسی طرح مسند احمد بن حنبل میں (بروایت محمد بن جعفر و حجاج بواسطہ شعبہ

(۱) الہدایہ علی فتح القدر، کتاب الذبائح ۹/۵۱۳ طبع بیروت۔

(۲) درحقیقت صاحب ہدایہ کی پیش کردہ یہ حدیث دو حدیثوں کے مجموعے کا مفہوم ہے، پہلی حدیث تو وہ ہے جس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے: "عن هشام بن زيد قال سمعت أنساً يقول: "أنفجنا أرنباً بمرو الطهران فسمي أصحاب رسول الله ﷺ خلقها، فأدركتها فأخذتها، فأتيت بها أبا طلحة فذبحها بمرو فبعث معي بفخذها أو بور كنها إلى النبي ﷺ فأكله، قلت أكله؟ قال قبله" (سنن الترمذی علی تحفۃ لا حوزی ۵/۳۰۰ طبع بیروت)۔

دوسری حدیث وہ ہے جس کو امام نسائی نے بروایت ابو ہریرہ نقل کی ہے: "جاء أعرابي إلى رسول الله ﷺ بأرنب قد شواها فوضعتها بين يديه فأمسك رسول الله ﷺ فلم يأكل وأمر القوم أن يأكلوا وأمسك الأعرابي فقال له النبي ﷺ ما يمنعك أن تأكل قال إني صائم لثلاثة أيام من الشهر" (سنن النسائی، کتاب الصوم ۳/۲۲۳ طبع استنبول)۔

(۳) البنایہ ۹/۸۷۔

(۴) صحیح البخاری، کتاب الہیہ ۳/۱۳۰ طبع استنبول۔

عن هشام بن زيد عن انس (حضور اقدس ﷺ) کا خرگوش کا گوشت کھانا مذکور ہے (۱)۔ روایت حضرت ابو ہریرہؓ جو سنن نسائی کے کتاب الصوم میں مذکور ہے، اس میں خرگوش کے بھنے ہوئے گوشت کا صحابہ کو کھانے کا حکم دینا اور خود نہ کھانا ثابت ہے اور اسی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ اگر مجھے خواہش ہوتی تو میں بھی کھاتا (۲)، روایت سیدنا عمر بن الخطابؓ مسند احمد، صحیح بن حبان، مسند بزار، مسند اسحاق بن راہویہ میں مذکور ہے (۳)۔

المغنی میں ابن قدامہ نے لکھا ہے کہ "خرگوش حلال ہے، سعد بن وقاص نے اسے کھایا، اس کی اجازت ابو سعید خدریؓ وغیرہ مختلف اصحاب نے دی اور یہ روایت صحیح ثابت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے اس کا ہدیہ قبول فرمایا (۴)۔

اور صاحب ہدایہ نے خرگوش کی حلت کی عقلی توجیہ کرتے ہوئے لکھا ہے: (اول) خرگوش درندہ نہیں ہے، (دوم) اور نہ مُردار کھاتا ہے، "ولأنه ليس من السباع ولا من أكلة الجيف فأشبهه الطيبي" (۵) (اس لئے کہ خرگوش نہ درندہ جانوروں میں سے ہے اور نہ مُردار جانوروں میں ہے، لہذا وہ ہرن کے مشابہ ہے)، اور جہاں تک اسے حیض آنے کا مسئلہ ہے تو اس سے کراہت طبعی تو پیدا ہو سکتی ہے کراہت شرعی نہیں، اسی لئے بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے بعض مواقع پر خود نہیں کھایا، لیکن دوسروں کو کھانے کی اجازت دی جب کہ آپؐ کو کسی نے یہ بتایا کہ اسے حیض آتا ہے (۶)۔

(۱) المسند الجامع کتاب الاطعمۃ ۲/ ۹۵، ۹۴ طبع دار البیروت۔

(۲) سنن النسائی، کتاب الصوم ۴/ ۲۲۳ طبع استنبول۔

(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے: البناہ شرح الہدایہ للعینی ۹/ ۸۸، ۸۷۔

(۴) "والأزالب مباحة، أكلها سعد بن أبي وقاص، ورخص فيها أبو سعيد وعطاء وابن المسيب والليث ومالك والشافعي وأبو ثور وابن المنذر ولا نعلم أحداً قانلاً بتحريمها إلا شيباناً وقد صح عن أنس أنه قال: — وبعث بوركها (أو قال) فخلدها إلى النبي ﷺ فقبله" — متفق عليه" (المغنی لابن قدامہ مع الشرح الکبیر ۱۱/ ۱۷ طبع دار الفکر بیروت)۔

(۵) الہدایہ ۱۳۱/ ۷ طبع کراچی پاکستان۔

(۶) البناہ شرح الہدایہ للعینی ۹/ ۸۸۔

ابن قدامہ نے لکھا ہے: "ولأنها حيوان مستطاب ليس بذي ناب الطيبي" (۱) (یہ پاک صاف جانور ہے، ذی ناب (درندہ) نہیں ہے، پس ہرن کے مشابہ ہے)۔ پس اصل تو یہی ہے کہ کسی چیز کے حرام و حلال ہونے کا تعلق شریعت سے ہے، لہذا جس چیز کا کھانا اور کھانے کی اجازت دینا رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، اس کے حلال ہونے میں شبہ نہیں۔

رہا حکمت کا سوال تو جیسا کہ صاحب ہدایہ نے لکھا، خرگوش ہرن کے مشابہ ہے، بلی کے نہیں، فرق یہ ہے کہ بلی درندہ جانور ہے، بلی حرام چیزیں چوہا وغیرہ کھاتی ہے اور خرگوش نہ درندہ ہے، نہ حرام چیزیں کھاتا ہے، نہ مُردار خور ہے، اس لئے اس کی حرمت کا سوال نہیں پیدا ہوتا، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱) المغنی مع الشرح الکبیر ۱۱/ ۱۷ طبع دار الفکر بیروت۔

کتاب الخطر والاباحۃ

بوقت ضرورت ثائی لگانے کی گنجائش ہے

زید ایک کمپنی میں کام کرتا ہے، اصلاً تو اسے میدان میں کام کرنا رہتا ہے، لیکن کبھی کبھی کمپنی کی آفس میں بھی جانا ضروری ہوتا ہے، کمپنی میں جانے کے لئے ثائی لگا کر جانا ضروری ہے، کیا ایک مسلمان ایسی صورت میں ثائی لگا سکتا ہے؟

الجواب وبالله التوفیق

گنجائش ہے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کیا دوسروں کو خون دینا اور بلڈ بینک قائم کرنا جائز ہے؟

موجودہ زمانہ میں دینی مدارس بالخصوص وہ مدارس جو سرفہرست ہیں، سرکار اور غیر مسلموں کی نظر میں بدظنی کا مقام اور محو رہنے ہوئے ہیں، جو کسی سے مخفی نہیں ہے۔

ایسی صورت حال میں ہمارے شہر کے نامور وہ افراد جو دین و ملت کے خیر خواہ ہیں اور رفاہی کام میں غیر مسلموں کے شانہ بشانہ رہتے ہیں، ایسے چند حضرات ہمارے مہتمم صاحب سے مل کر درخواست کی کہ آئندہ یوم آزادی کے موقع پر شہر کے مختلف کلبوں (Clubs) اور جامعہ کا اجتماعی اقدام یہ ہو کہ ضرورت مند مریضوں کو خون دینے کے لئے بڑے پیمانہ پر مفت میں خون دینے کا کیمپ قائم ہو۔

خصوصی طور پر جامعہ کو شامل کرنے کا مقصد ان کی نظر میں یہ بھی ہے کہ جامعہ کی کارکردگی حکومت اور غیر مسلم عوام کی نظر میں اجاگر ہو۔

واضح رہے کہ یہ پروگرام مروجہ طریقہ پر سرکاری ہسپتالوں میں بلڈ بینکوں کے ماتحت جمع کیا جاتا ہے اور حسب ضرورت اضطراری حالت میں مریضوں کو مفت فراہم کیا جاتا ہے، کیمپ میں خون دینے والوں کو بلڈ بینک کی طرف سے ایک کارڈ فراہم کیا جاتا ہے، جو حسب ضرورت حامل کارڈ کو خون ملنے کی ضمانت ہوتی ہے، تجربہ میں یہ دیکھا گیا ہے کہ کارڈ نہ ہونے پر بلڈ بینکوں کی طرف سے بالکل نہ کہہ دیا جاتا ہے، ادھر بازاروں میں بسا اوقات ایسے شدید ضرورت کے وقت بھی خون نہیں ملتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان احوال کے پیش نظر جامعہ کے بعض اساتذہ اور طلبہ کے لئے اس پروگرام میں شرکت کی گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب وبالله التوفیق

دوسروں کا خون استعمال کرنا ظاہر ہے کہ اضطراری حالت میں جائز ہے، جب خون کا استعمال جائز ہے تو خون کا ہبہ کرنا بھی جائز ہے، ہبہ کرنے کے لئے حالت اضطرار کا انتظار ضروری نہیں، اگر بروقت خون نہیں ملا، یا خون ایک دوسرے کے موافق نہیں ثابت ہوا تو جب تک گروپ ملایا جائے گا اور گروپ والے آدمی کو تلاش کیا جائے گا مریض کی جان چلی جائے گی، لہذا خون کا عطیہ دینا، اس کا بینک قائم کرنا اور اس اچھے کام کے لئے کیمپ لگانا جائز اور درست ہے۔ اس ذیل میں حضرت مفتی نظام الدین صاحب سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ نظر میں رہے (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کیا غیر مسلموں کی رقم مسجد کی تعمیر اور روزہ داروں کے افطار میں خرچ

کرنا جائز ہے؟

غیر مسلموں کی رقم سے مسجد کی تعمیر کرنا یا اس کے روپیہ سے روزہ دار کو افطار کرانا یا

اماموں کو تنخواہ دینا یا کسی دوسرے مد میں اس کا استعمال کہاں تک درست ہے،
مفصل و مدلل تحریر فرمائیں۔

الجواب وبالله التوفیق

اگر غیر مسلم اس طرح کے کاموں کو نیکی اور بھلائی کا کام سمجھتا ہے اور کارِ ثواب ہونے کے
ناظرے اس میں مدد کرتا ہے تو اس کی مدد قبول کرنا جائز ہوگا، اسی طرح بہت سے غیر مسلم روزہ داروں کو
افطار کرانا بھی کارِ ثواب سمجھ کر افطار کا سامان مسجدوں میں بھیجتے ہیں، اس کو بھی قبول کرنے میں کوئی
حرج نہیں، لیکن اگر یہ بات سمجھ میں آتی ہو کہ اس طرح کے تعاون کا مقصد سیاسی یا تجارتی مادی مفاد
ہے، یا اس طرح کی مدد کو قبول کرنے کے نتیجے میں غیر مسلموں کے مشرکانہ اعمال میں مسلمانوں
کو تعاون کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا تو ایسی صورت حال میں اس طرح کی کسی مدد کو قبول کرنا درست
نہیں ہوگا (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

تبلیغ دین کے لئے ریڈیو اسٹیشن قائم کرنا

کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان شرع متین مذکورہ امور کے بارے میں:

جنوبی افریقہ ایک آزاد ملک ہے جس میں اکثریت حبشیوں کی ہے، مذہب یا تو وہ

(۱) "شرط وقف الذمی أن یکون قربة عندنا وعندهم کالوقف علی الفقراء أو علی مسجد
القدس بخلاف الوقف علی بیعة فإنه قربة عندهم فقط أو علی حج أو عمرة فإنه قربة عندنا
فقط فأفاد أن هذا شرط لوقف الذمی فقط، لأن وقف المسلم لا یشرط کونه قربة عندهم
بل عندنا کوقفنا علی حج و عمرة بخلافه علی بیعة فإنه غیر قربة عندنا بل
عندهم" (رد المحتار ۶/ ۵۲۳، ۵۲۶ طبع بیروت)۔

اور البحر الرائق میں ہے: "وأما الإسلام فلیس من شرطه فصیح وقف الذمی بشرط کونه قربة
عندنا وعندهم کمالو وقف علی اولاده أو علی الفقراء أو علی فقراء أهل الذمة" (البحر
الرائق ۵/ ۲۰۳ طبع بیروت)، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: کفایت المفتی ۷/ ۸۰۳، امداد الفتاویٰ
۲/ ۲۸۹، ۲۹۰، فتاویٰ امارت شریعہ تحقیق حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاضی ۱/ ۲۱۰، ۲۱۱۔

عیسائی ہیں یا بت پرست، اس وقت ملک میں متحدہ حکومت ہے جس میں ہر طبقے
کی نمائندگی ہے۔

آزادی کے بعد ہر مذہب والوں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کی عام اجازت ہے، اس
سلسلہ میں حکومت سے اجازت لے کر اپنا ذاتی ریڈیو اسٹیشن بھی قائم کر سکتے ہیں
اور اس کے ذریعہ سے چوتھیں گھنٹے اپنے مذہب کی اشاعت کر سکتے ہیں، جس
طرح امریکہ اور یورپ سے عیسائی حضرات اور ممالک اسلامیہ سے مسلمان
اپنے مذاہب کی اشاعت کرتے ہیں۔

یہاں کے مسلمان بھی اپنا ذاتی ریڈیو اسٹیشن قائم کرنا چاہتے ہیں، جس کا پورا
انتظام علماء کے ہاتھ میں ہوگا اور اس پر سے کوئی بھی غیر شرعی پروگرام شائع نہیں
ہوگا، اس سلسلہ میں علماء کا اختلاف ہو گیا ہے، اکثر ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کے
موافق ہیں، مگر بعض حضرات اس کے شدید مخالف ہیں۔

موافق حضرات کے دلائل اور حجت یہ ہیں:

- ۱- یہ ایک ذریعہ اشاعت ہے، لاؤڈ اسپیکر کی طرح اس کے استعمال میں کوئی قباحت
نہیں۔
- ۲- غیر مسلموں کو دین پہنچانے کا یہ بہترین ذریعہ ہے، خاص کر حبشی حضرات کو۔
- ۳- اکثر مسلمان ریڈیو پر غلط پروگرام سنتے ہیں، دینی پروگرام ہوتے ہوئے اس میں
کسی حد تک تخفیف ہوگی۔
- ۴- قادیانی، شیعہ اور روشن خیال حضرات بھی اپنا اسٹیشن قائم کرنا چاہتے ہیں، ہمیں
ان کے غلط پروپیگنڈے کا مقابلہ کرنا چاہیے۔
- ۵- مسلمانوں کو دین سکھانے کا یہ نافع ذریعہ ہے۔
- ۶- چونکہ قبضہ و کنٹرول پورا علماء اور صحیح العقیدہ حضرات کے ہاتھ میں ہوگا، غلط
اشاعت کا اندیشہ نہیں۔

جو حضرات اس کے موافق نہیں، ان کا کہنا یہ ہے:

- ۱- اس کی کوئی ضرورت نہیں۔
- ۲- یہ کافروں کا طریقہ ہے، ہمارے اسلاف کا نہیں۔
- ۳- شیعہ اور دوسرے فرق باطلہ ریڈیو اسٹیشن قائم کرنا چاہیں تو کریں، ہمیں مثبت انداز میں ان کا مقابلہ کرنا چاہئے۔
- ۴- ان کے نئے نئے طریقوں کی کوئی حد نہیں، ہم کہاں تک ان کا مقابلہ کریں گے، ہمیں تو قرآن وحدیث پر عمل کرنا چاہئے۔
- ۵- جس طرح تبلیغی جماعت کے حضرات کام کرتے ہیں ہمیں بھی اسی طرح کام کرنا چاہئے۔
- ۶- جماعت کے اکابر کو بھی دین کی اشاعت کی اتنی ہی فکر ہے تو وہ کیوں ان ذرائع کو استعمال نہیں کرتے ہیں؟
- ۷- آپ کا یہ کہنا کہ موسیقی اور دوسرے پروگرام نہیں سنیں گے، یہ بالکل غلط ہے، شیطان نے ان کو اتنا بہکا دیا ہے کہ وہ آپ کے پروگرام کی طرف بالکل توجہ نہیں کریں گے۔
- ۸- آج آپ ریڈیو اسٹیشن قائم کرنا چاہتے ہیں کل آپ ٹیلی ویژن اور وی سی آر کے جواز کے قائل ہوں گے۔
- ۹- مفتی شفیع صاحب جب ریڈیو پاکستان پر سے تفسیر بیان فرماتے تھے تو اس کا کوئی چرچا نہیں تھا، مگر یہی تفسیر جب کتاب کی شکل میں شائع ہوئی تو بہت مقبول ہوئی، لہذا ہمیں بھی ریڈیو کے بجائے اس طرح اشاعت پر توجہ دینی چاہئے۔
- ان حضرات کے مفصل دلائل و بیان اس استفتاء کے ساتھ الگ منسلک ہیں۔
- ۱- کیا ریڈیو سے دینی پروگرام شائع کرنا جائز ہے یا نہیں؟
- ۲- مسلمانوں کے مفاد کے خاطر اور اسلام کی اشاعت کے خاطر مسلمانوں کو اپنا ذاتی ریڈیو اسٹیشن قائم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

- ۳- ممالک اسلامیہ میں ریڈیو پر قرآن کی تلاوت و تفسیر، احادیث، ملفوظات مشائخ اور تقاریر شائع کئے جاتے ہیں، ان کا یہ عمل شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ حرام یا مکروہ یا مندوب و مباح و مستحسن ہے؟ وضاحت فرمائیں۔
- ۴- اپنی ذاتی رائے بھی بیان فرمائیں تاکہ ہمیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔
- امید ہے کہ ہماری رہنمائی فرما کر ممنون و مشکور فرمائیں گے۔

الجواب وبالله التوفیق

مسلمانوں کے لئے موقع ہے کہ جنوبی افریقہ میں اپنا نجی ریڈیو اسٹیشن قائم کریں اور اس کے ذریعہ اسلام کی ترویج و اشاعت کا کام کریں، سوال میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ اگر ایسا ریڈیو اسٹیشن حاصل کیا جاسکا تو اس کا پورا انتظام علماء کے ہاتھوں میں ہوگا اور اس پر کوئی غیر شرعی پروگرام نشر نہیں ہوگا۔

سوال میں ہر دو نقطہ نظر رکھنے والے علماء کے دلائل بھی ذکر کر دئے گئے ہیں، جس پر غور کیا گیا۔

اس حقیر کے نزدیک ریڈیو کی حقیقت ذریعہ ابلاغ اور ایک آلہ کی ہے، جس کے ذریعہ ہم اپنی بات دور دور تک پہنچا سکتے ہیں اور ریڈیو کا آج جو بے جا استعمال ہو رہا ہے، یہ ایک ذریعہ ابلاغ کا غلط استعمال ہے، جہاں تک نفس ریڈیو کے ذریعہ اپنی بات دور تک پہنچانے کا سوال ہے، اس میں کوئی عیب نہیں، اس لئے فقہاء کی زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ ”ریڈیو“ ”مما لا تقوم المعصیۃ بعینہ“ کی قبیل سے ہے، یعنی اصل شی میں کوئی معصیت نہیں ہے، معصیت باہر سے آتی ہے اور وہ اشیاء جن کی ذات میں کوئی معصیت نہ ہو، بلکہ معصیت خارج سے آتی ہے، ان کا استعمال اس خارجی معصیت کا ارتکاب کئے بغیر جائز ہے، علاوہ اس کے شریعت کا اصول ”سد ذریعہ“ بھی ہے اور ”فتح ذریعہ“ بھی ہے، اگر ریڈیو کا استعمال مقاصد خیر کے لئے کرنا مقصود ہے تو جائز ہوگا اور اگر اس کا استعمال معصیت کے لئے ہو تو اگرچہ نفس ریڈیو میں کوئی عیب نہیں، لیکن معصیت کا دروازہ روکنے کے لئے اس کا استعمال ممنوع ہوگا (سد ذرائع اور فتح ذرائع کے تفصیلی احکام کتب اصول میں مطالعہ

(کریں) (۱)۔

دوسری طرف یہ واقعہ ہے کہ الیکٹرونک میڈیا انسانی ذہن و فکر کی تبدیلی میں غیر معمولی طور پر مؤثر ہے، کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس طاقتور اور مؤثر ذریعہ کو اشاعت حق کے لئے استعمال نہ کریں (اگر ایسا کرنا اور شر سے محفوظ رکھنا ممکن ہو)۔

یہ کہنا کہ اس کی ضرورت نہیں، صحیح نہیں ہے، مسلمانوں کو مسائل و احکام سے واقف کرانے کے لئے غیر مسلموں تک سیرت نبوی اور صحابہ کرام و دیگر علماء و صالحین کے واقعات مؤثر طور پر پیش کرنا اور جو ہماری مجلسوں میں نہیں آسکتے، ان کے گھر گھر میں حق کی آواز پہنچانے کی ضرورت ہے اور یہ تسلیم کر کے چلنا کہ سبھی لوگ صرف گانا بجانا سننا چاہتے ہیں ایسا نہیں ہے، بہت سے سلیم الفطرت لوگ اپنی ذہنی الجھنوں کا حل جاننا چاہتے ہیں، ایسے لوگ ریڈیائی پیغام اور نشریہ کے ذریعہ اسلام کی سچائی تک پہنچ سکتے ہیں۔

ریڈیو یا اس طرح کے دوسرے سائنسی آلات پر کافروں کی اجارہ داری نہیں ہے، سلف کے زمانہ میں جو چیز موجود نہیں تھی، اس کے بارے میں سلف کے تعامل سے استدلال غلط ہے، سیکڑوں ایسی چیزیں ہیں جو سلف کے زمانہ میں نہیں تھیں، اس لئے انہوں نے ان کا استعمال نہیں کیا۔ اب موجود ہیں اور اب ہم ان کا استعمال کرتے ہیں، عہد نبوی و صحابہ میں کتابوں کی نشر و اشاعت کا نظام نہیں تھا، بعد کو مخطوطات کا رواج ہوا، پھر لیتھو پریس کا، پھر آفسیٹ کا اور اب کمپیوٹر پر پرنٹنگ کا، تو کیا ہم ان اشیاء کا استعمال نہیں کریں، اس لئے کہ اسلاف کا طریقہ نہیں ہے۔

نئے چیلنجز کا تو مقابلہ کرنا ہی ہے، قرآن کریم نے دعوت، تبلیغ اور تجدید کا حکم دیا ہے، اس کی صورت نہیں متعین کی گئی، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ذرائع مختلف زمانہ میں بدلتے رہیں گے۔ خود حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی دعوت تبلیغ میں نئے زمانہ میں دعوت کے لئے قدیم اصولوں پر مبنی نئے طریقہ اور نظام کو اختیار کیا گیا ہے، ورنہ تفصیلی طور پر جماعت کے طریقہ کار کے

(۱) الفروق للقرافی ۳۲/۲ طبع بیروت، تہذیب الفروق علی الفروق ۲/۳۳، مقدمہ ابن رشد ۱۹۷۷، الموافقات ۱۹۸/۳ طبع قاہرہ، الموسوعة الفقهیہ ۲۳/۶۲۷ ۲۸۲ وغیرہ۔

ہر جزئیہ کی متعین صورت اسلاف کے یہاں نہیں ملے گی، حضرت مولانا نے جس طرح اپنے زمانہ کے حالات کو دیکھ کر یہ نیا طریقہ اپنایا وہ اپنی جگہ کتنا مؤثر ہے، وہ واضح ہے، محض کچھ وہی امور کا سہارا لے کر ”کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے“ اس مفید کام کو روکنا مناسب نہیں ہوگا۔ بہر حال حاصل بحث یہ ہے کہ اس حقیر کے نزدیک:

۱- ریڈیو کے ذریعہ دینی پروگرام شائع کرنا شرعاً جائز ہے۔

۲- مسلمانوں کے مفاد اور اسلام کی اشاعت کی خاطر مسلمانوں کو ان مخصوص مقاصد کے لئے اپنا ذاتی ریڈیو اسٹیشن قائم کرنا (جو اشاعت فحشاء و منکرات سے پاک ہو) جائز ہے۔

۳- ریڈیو پر تلاوت، تفسیر، احادیث وغیرہ کی اشاعت کا عمل شرعاً جائز ہے، بلکہ سعودیہ وغیرہ میں بہت سے غیر مسلموں نے ریڈیوں پر اسلام کے تعارفی نشریوں کی برکت سے اسلام بھی قبول کیا ہے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مجاہد الاسلام قاسمی ۷ جون ۱۹۹۵ء

الجواب صحیح

انیس الرحمن قاسمی

نائب قاضی شریعت، ۷ محرم الحرام ۱۴۱۶ھ

الجواب صحیح

نسیم احمد قاسمی

رفیق اسلامک فنڈ اکیڈمی انڈیا، ۷ محرم الحرام ۱۴۱۶ھ

الجواب صحیح

محمد جنید عالم قاسمی

۷ محرم الحرام ۱۴۱۶ھ

الجواب صحیح

سمیل احمد

نائب مفتی امارت شرعیہ بہار دارلہ

۷ محرم ۱۴۱۶ھ

میں گھر کا پیسہ شامل ہے، اعلانیہ طور پر خاگی، ہوا رہ نہیں ہو اور زبانی طور سے ہم سب سے یہی کہتے ہیں کہ ہم مل کر ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔ امید کہ جناب والا اس کا جواب مرحمت فرما کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

الجواب وبالله التوفیق

ہمارے سماج میں عام طور پر یہ بات معروف ہے، چند بھائی اجمالی خاندان کی طرح رہتے ہیں، ان میں کوئی زیادہ کماتا ہے تو کوئی کم اور کوئی کماتا ہی نہیں ہے، کوئی پڑھنے لکھنے میں مشغول ہے، کوئی کھیتی باڑی کو دیکھتا ہے اور کوئی نوکری کرتا ہے، مشترک جائداد ہے، اس کی آمدنی بھی گھر پر صرف ہوتی ہے، کمانے والے کو نوکری یا تجارت سے جو آمدنی آتی ہے وہ بھی گھر پر خرچ ہوتی ہے، کچھ عرصہ تک تو گھر بغیر حساب کتاب بہت اچھی طرح چلتا ہے، لیکن پھر میں اور تو، اور میرے اور تیرے کا جھگڑا شروع ہو جاتا ہے، معاملات واضح نہیں رہتے، کوئی شخص اپنی آمدنی سے حاصل جائداد کو اپنی ذاتی قرار دیتا ہے، دوسرے لوگ اسے مشترک قرار دے کر اس میں اپنے حصہ کے طالب ہوتے ہیں، ان حالات میں سخت بگاڑ پیدا ہوتا ہے، اس لئے آپ کے لئے مندرجہ بالا حالات میں مشورہ یہ ہے کہ آپ دیگر بھائیوں کو بٹھا کر پورے معاملات صاف کر لیجئے اور پھر اپنی ذاتی آمدنی سے جو کچھ خریدنا ہو خرید لیں۔ اب تک جو کچھ حاصل ہوا یا خرچ ہوا اسے مشترک مانئے، کس پر کم خرچ ہو اس پر زیادہ خرچ ہو یا یہ ہرگز نہ جوڑئے، یہ ساری گفتگو آپ کی ذاتی، موروثی یا اپنی حاصل کردہ جائداد کے بارے میں ہے، آپ بھائیوں میں سے کسی کی اہلیہ کو اس کے میکے سے یا کہیں اور سے کوئی آمدنی ہوئی ہو یا کوئی جائداد حاصل ہوئی ہو تو وہ مشترک شمار نہیں ہوگی، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

بیوہ کو کتنا حصہ ملے گا جبکہ اس کی کوئی اولاد نہ ہو؟

میرا نام کلام الدین ہے، میرا ایک بڑا بھائی عظیم الدین تھا جو پانچ ماہ قبل انتقال کر گیا، مرحوم بھائی کی ایک بیوہ ہے، کوئی اولاد نہیں ہے، ہمارے والدین باحیات ہیں، گاؤں پر رہتے ہیں، دہلی میں ہم دونوں بھائیوں نے اپنی کمائی سے

ایک چھوٹا سا مکان بنایا ہے، کاغذ پر ہم دونوں کا نام ہے، مرحوم بھائی کے سر صاحب کا کہنا ہے کہ اس مکان میں وہ آدھے کے حق دار ہیں، یعنی مرحوم بھائی کا پورا حصہ اس کی بیوہ کو ملنا چاہئے، اس طرح وہ ترکہ میں والدین کے حق کو تسلیم نہیں کرتے ہیں، فی الحال انہوں نے اس مکان میں کرایہ دار رکھ دیا ہے۔ مزید برآں ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ گاؤں پر جو مکان ہے جو والد صاحب کے نام سے ہے، اس میں بھی مرحوم کا حصہ ہے جو بیوہ کو ملنا چاہئے۔ شرعی اعتبار سے بیوہ کا کہاں اور کتنا حصہ بنتا ہے اس کی وضاحت کر دی جائے، اللہ آپ کو اس کا اجر عطا فرمائے۔

الجواب وبالله التوفیق

دلی میں جو مکان دونوں بھائیوں نے اپنی کمائی سے بنایا اس میں دونوں بھائی آدھے آدھے کے مالک ہوئے، اب جب بڑے بھائی عظیم الدین کا انتقال ہو گیا تو ان کا آدھا حصہ ان کا متروکہ ہوا، تجہیز و تکفین اور ادائے دین اور اجرائے وصیت از ثلث مال کے بعد جو بچے اس میں چار آنہ اس کی بیوہ کا ہوا، ماں کو بھی اس میں چار آنہ (ثلث الباقی) اور باپ کو آٹھ آنہ ملے گا۔ والد چونکہ زندہ ہیں، اس لئے ان کی ملکیت میں ابھی تقسیم ہونے کا کوئی سوال نہیں، ان میں عظیم الدین کی بیوہ کا کوئی حصہ نہیں ہوگا، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

بیوی، چار لڑکے اور ایک لڑکی کے درمیان وراثت کی تقسیم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و شرع متین مسئلہ ہذا کے بارے میں: زید نے فرحانہ سے شادی کی، اس کے بطن سے ایک لڑکا حامد اور ایک لڑکی زاہدہ پیدا ہوئی، جو باحیات ہیں، فرحانہ کے انتقال کے بعد زید نے دوسری شادی رخسانہ سے کی، اس کے بطن سے تین لڑکے راشد، خالد، عابد پیدا ہوئے جو باحیات ہیں، اس کے بعد زید کا انتقال ہو گیا، اس نے ورثہ میں دو مکان اور پانچ بیگھا زمین چھوڑی، جس کی صورت یہ ہے کہ ایک مکان اپنی دوسری بیوی کو

انتقال کے وقت مہر میں دے دیا، پہلی بیوی کے لڑکے کے نام ایک بیگھا زمین نابالغ میں لکھ دیا تھا جواب تک اس کے نام ہے، دوسری بیوی کے بھی ایک لڑکے کے نام آدھا بیگھا زمین نابالغ کے وقت سے اس کے نام ہے۔

۱- مندرجہ بالا صورت میں وراثت کی تقسیم فرمائیں۔

۲- جن لڑکوں کے نام زمین رجسٹرڈ ہے کیا وہ ان لڑکوں کے حصہ میں رہتے ہوئے بقیہ اس زمین میں تقسیم ہوگی جو زید مرحوم کے نام ہے۔

الجواب وبالله التوفیق

۱- زید نے مرنے کے بعد جو کچھ اپنی ملکیت چھوڑی ہے اس میں سے پہلے خرچ تجہیز و تکفین نکالا جائے گا، پھر اس کے تمام دیون ادا کئے جائیں گے، اگر زید نے پہلی زوجہ فرحانہ کو مہر ادا نہیں کیا تھا تو وہ بھی زید پر دین ہے جو زید کے ترکہ سے نکال کر فرحانہ کے وارثان میں تقسیم کیا جائے گا، پھر اگر زید نے غیر وارث کے حق میں کوئی وصیت کی ہو تو تہائی مال سے وصیت پوری کی جائے گی، بعد ازاں بقیہ کل ترکہ زید کی زوجہ رخسانہ جو بوقت موت زید کی زوجیت میں تھی، زید کے چاروں لڑکوں اور ایک لڑکی کے درمیان اس طرح تقسیم ہوگا کہ ترکہ کو ۷ حصوں میں تقسیم کر کے زوجہ رخسانہ کو ۹ حصے، چاروں لڑکوں حامد، راشد، خالد اور عابد میں سے ہر ایک کو ۱۳، ۱۳، ۱۳ حصے اور لڑکی زاہدہ کو ۷ حصے ملیں گے۔

۲- زید نے اپنا جو مکان اپنی زوجہ رخسانہ کو مہر میں دے دیا تھا وہ زوجہ رخسانہ کی ملکیت ہے، وہ مکان زید کے ورثاء میں تقسیم نہیں ہوگا، اسی طرح زید نے اپنے نابالغ لڑکے حامد کو ایک بیگھا زمین اور دوسری بیوی سے ایک نابالغ لڑکے کو آدھا بیگھا زمین لکھ دی تھی اور وہ زمین ان بچوں کے نام رجسٹرڈ ہیں، یہ زمینیں زید کی طرف سے ان بچوں کے نام ہبہ قرار پائیں گی، اور والد کا قبضہ ہی نابالغ بچے کی طرف سے قبضہ تصور کیا جائے گا، فتح القدیر میں ہے: "وإذا وهب الأب لابنه الصغير هبة ملكها الابن بالعقد، لأنه في قبض الأب فيسبب عن قبض الهبة" (۱)، لہذا دونوں بچوں کے نام رجسٹرڈ زمین ان بچوں

کی ملکیت ہوگی اور ان میں وراثت جاری نہیں ہوگی (۱)، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

لڑکیوں کے ساتھ بھتیجہ کا حصہ

زید اپنی چھ دھور زمین چھوڑ کر مر گئے اور اس وقت ان کی اولاد میں دو لڑکی ایک بھتیجہ ہے۔ چھ دھور زمین پر بھتیجہ کا مکان ہے، لہذا دونوں لڑکی اور بھتیجہ کا حصہ کیا ہوگا؟ ہمارا اصول فقہ کیا کہتا ہے، جوابی ڈاک سے جلد از جلد مطلع کریں تو آپ کی عین نوازش ہوگی۔

الجواب وبالله التوفیق

صورت مذکورہ میں اگر زید نے انتقال کے وقت صرف اپنی دو بیٹیوں اور بھتیجہ کو چھوڑا ہے تو بعد تقدیم ماہ تقدم علی الارث ان کی جائداد (۶ دھور) کو چھ حصے کر کے دو حصہ ان کی دونوں لڑکیوں اور بھتیجہ میں سے ہر ایک کو (یعنی دو دھور فی کس) از روئے شرع ملیں گے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

بیوی، تین لڑکے اور چار لڑکیوں کے درمیان ترکہ کی تقسیم

محمد شریف میاں نے اپنے انتقال کے وقت ایک بیوی، تین لڑکے اور چار لڑکیوں کو وارثان چھوڑا، مذکورہ وارثان کو از روئے سہام شرعی کیا ملے گا؟

الجواب وبالله التوفیق

بشرط صحت سوال وعدم موانع ارث اخراجات کفن دفن وادائے قرض وغیرہ کے بعد شریف میاں مرحوم کے بقیہ متروکہ (۱۶) کو اسی حصے کر کے دس حصے یعنی ۲۰ ان کی بیوی کو، چودہ حصے کر کے (۹ ۱/۲ پائی فی کس) ان کے تینوں لڑکوں میں سے ہر ایک کو اور سات سات حصے کر کے

(۱) واضح رہے کہ زید مرحوم نے اپنی حیات میں جن دو لڑکوں کو ایک بیگھا اور آدھا بیگھا زمین بطور ہبہ لکھ دیا تھا، اس کی وجہ سے وہ دونوں لڑکے زید مرحوم کی باقی جائداد سے محروم نہیں ہوں گے، بلکہ ان کو بھی اتنا حصہ ملے گا جتنا ان کے دوسرے بھائیوں کو مل رہا ہے۔

(۱/۳۵ پائی فی کس) ان کی چاروں لڑکیوں میں سے ہر ایک کو شرعاً ملیں گے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

تقسیم ترکہ کا اہم مسئلہ

عبدالرزاق صاحب نے انتقال کیا، چھوڑا ایک بیوی مسماة مسوپن، ایک لڑکا محمد جمال، دو لڑکی شرفو خاتون اور برفو خاتون، پھر شرفو خاتون کا انتقال ہوا چھوڑا ایک شوہر عبدالسلام، ایک لڑکا (جو چند روز کے بعد انتقال کر گیا) ایک ماں مسماة مسوپن، ایک بھائی جمال، ایک بہن برفو، پھر محمد جمال نے انتقال کیا، چھوڑا ایک بیوی مسماة امت، دو لڑکا محمد شفیع اور کمال، چھ لڑکی ہاجرہ خاتون، سیدہ خاتون، حبیبہ خاتون، نسیمہ خاتون، شمیمہ خاتون، جمیمہ خاتون، ایک ماں مسماة مسوپن، ایک بہن برفو، اب بتایا جائے کہ عبدالرزاق کی جائداد میں کس کا کتنا حصہ ہوگا؟

الجواب وبالله التوفیق

بصورت صحت سوال وعدم موانع ارث، اخراجات کفن دفن وادائے قرض وغیرہ کے بعد عبدالرزاق مرحوم کے بقیہ متروکہ (۱۶/۱۶) کو تین ہزار آٹھ سو چالیس حصے کر کے ان کی بیوی مسماة مسوپن کو نو سو حصے (۹/۳ پائی)، ان کی لڑکی برفو خاتون کو آٹھ سو چالیس حصے (۶/۳ پائی)، عبدالسلام زوج شرفو کو سات سو حصے (۱۱/۲ پائی)، مسماة امت زوجہ جمال کو دو سو دس حصے (۱۰/۱ پائی)، محمد جمال کے دونوں لڑکوں میں سے ہر ایک کو دو سو اڑتیس حصے (۱۱/۱ پائی فی کس) اور ان کی چھ لڑکیوں میں سے ہر ایک کو ایک سو انیس حصے (۵/۱ پائی فی کس) از روئے شرع ملیں گے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتابیات

قرآن

القرآن الکریم

تفسیر

الجامع لأحكام القرآن

التفسیر المظہری

الإمام أبو عبد الله محمد بن أحمد الأنصاري القرطبي

الشيخ ثناء الله الباني نتي

احادیث اور ان کی شروحات

الصحيح للبخاری

الصحيح لمسلم

سنن الترمذی

سنن أبی داؤد

سنن النسائی

سنن الدار قطنی

سنن سعید بن منصور

المستند للإمام أحمد بن حنبل

مصنف بن أبی شیبہ

المستند الجامع

الإمام أبو عبد الله محمد بن إسماعيل البخاری

الإمام أبو الحسن مسلم بن الحجاج القشیری

الإمام أبو عيسى محمد بن مسرة الترمذی

الإمام سليمان بن الأشعث أبو داؤد السجستانی

الإمام أحمد بن علي النسائی

شيخ الإسلام الحافظ علي بن عمر الدار قطنی

الإمام سعيد بن منصور بن شعبه الحرسائی

الإمام أحمد بن حنبل أبو عبد الشیبائی

الإمام أبو بكر عبد الله بن محمد بن أبی شیبہ الکوفی

[رتہ] الدكتور بشار عواد معروف وشرکاء

مشكاة المصابيح	الإمام ولى الدين محمد بن عبد الله الخطيب التبريزى
اعلاء السنن	المحدث العلامة ظفر أحمد التهانوى
شرح معالى الآثار	الحافظ أبو جعفر أحمد الطحاوى الحنفى
فتح البارى	الحافظ أبو الفضل شهاب الدين ابن حجر العسقلانى
عمدة القارى	العلامة بدر الدين أبو محمد محمود بن أحمد العيني
فيض البارى	الحافظ المحدث أنور شاه الكشميرى
معالم السنن شرح سنن أبى داود	الإمام أبو سليمان حمد بن محمد الخطابى
شرح النووى	الشيخ محى الدين أبو زكريا يحيى بن شرف الدين النورى
تحفة الأحردى	الحافظ أبو العلا محمد عبد الرحمن المنار كפורى

فقه وأصول فقه

الف

أحكام الأوقاف	أبو بكر أحمد بن عمر الشيبانى المعروف بـ "الخصاف"
الاختيارات الفقهية	الشيخ أبو الحسن على بن محمد بن عباس البعلى
الأشباه والظائر	العلامة زين الدين بن النجيم الحنفى المصرى
امداد الفتاوى	الشيخ أشرف على التهانوى المعروف بـ "حكيم الأمت"

ب

البحر الرائق	العلامة زين الدين بن النجيم الحنفى المصرى
بدائع الصنائع	الشيخ علاؤ الدين أبو بكر بن مسعود الكاسانى الحنفى
بداية المجتهد	القاضى أبو الوليد بن رشد القرطبى
البلاغ	مفتى أعظم نمبر

ت

التبليغ	الشيخ أشرف على التهانوى المعروف بـ "حكيم الأمت"
تبيين الحقائق	العلامة أبو محمد فخر الدين عثمان بن على الربيعى
تنوير الأبصار	شيخ الإسلام محمد بن عبد الله التمرناشى
تهذيب الفروق	الشيخ محمد على بن حسين المكي المالكي

ث

الشعر الدانى فى تقريب الحائى	الشيخ صالح عبد السميع الآبى الأزهرى
------------------------------	-------------------------------------

ج

جواهر الفقه	الشيخ محمد شفيع العثمانى الديوبندى
-------------	------------------------------------

ح

حاشية الدسوقى	الشيخ محمد بن أحمد بن عوفه الدسوقى
---------------	------------------------------------

حاشية شلبى على تبيين الحقائق	الشيخ الإمام الشلبى
------------------------------	---------------------

حاشية الهداية على هامش فتح القدير	الشيخ الشهيد سعد بن عيسى بن امير خان
-----------------------------------	--------------------------------------

الحيلة الناجرة للحليلة العاجزة	الشيخ أشرف على التهانوى المعروف بـ "حكيم الأمت"
--------------------------------	---

د

الدار المختار	العلامة علاؤ الدين الحصكفى
---------------	----------------------------

الدر المنتقى على شرح الملتقى	العلامة علاؤ الدين الحصكفى
------------------------------	----------------------------

ر

ردالمحتار	العلامة محمد أمين ابن عابدين الشامى
-----------	-------------------------------------

ش

الشرح الكبير	الشيخ ابو البركات سيدى أحمد بن محمد العلوى الديوبندى
--------------	--

ع

عمدة الرعاية	الشيخ أبو الحسنات عبد الحى اللكوى
--------------	-----------------------------------

ف

فتاوى امارت شرعية	الشيخ ابو المحاسن محمد سجاد
الفتاوى التاتارخانية	الشيخ عالم بن العلاء الأنصارى الهندى
فتاوى دار العلوم	امرتب الشيخ المفتى ظهير الدين المفتاحى
فتاوى قاضى حان	فخر الدين محمود بن عبد العزيز الأوزجندى القرغانى
الفتاوى الهندية	الشيخ نظام الدين وجماعة من علماء الهند الأعلام
فتح باب العناية فى شرح النقاية	الشيخ على بن سلطان محمد الهروى المعروف بـ "ملا على قارى"
فتح القدير	الإمام كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيراسى المعروف بـ "ابن الهمام"
الفروق كبرى	الإمام شهاب الدين أحمد بن إدريس بن عبد الرحمن القرافى
كتاب العشر والركاة	الشيخ عبد الصمد الرحمانى
كتاب الفقه على المذاهب الأربعة	الشيخ عبد الرحمن الجزيرى
كفايت المفتى	الشيخ المفتى كفايت الله المعروف بـ "مفتى أعظم"
المسوط	شمس الأئمة السرخسى
مجلة فقه اسلامى	[مرتب] القاضى مجاهد الإسلام القاسمى
مجمع الأنهر	المحقق عبد الله بن محمد سليمان داماد آفندى
مجموعه رسائل ابن عابدين	العلامة محمد أمين بن عابدين الشامى
مجموعه فتاوى ابن تيميه	شيخ الإسلام أحمد بن تيميه
مجموعه فتاوى ابن باز	الشيخ عبد العزيز بن عبد الله بن باز

م

معين الحكام

أبو الحسن على بن خليل الطرابلسى
الإمام شمس الدين ابن قدامه المقدسى
الإمام أبو الوليد محمد بن أحمد بن رشد
الشيخ رحمة الله السندى
أبو إسحاق إبراهيم بن موسى اللحى

المعنى

مقدمه ابن رشد

مناسك ملا على قارى

الموافقات

ن

نظام الفتاوى

الشيخ المفتى نظام الدين الأعظمى

هـ

الهداية

الإمام أبو الحسن على بن أبى بكر المرغينانى

لغت وموسوعه

لسان العرب

الإمام جمال الدين بن منظور

موسوعة عمر بن الخطاب

الدكتور رؤاس قلعه جى

موسوعة على بن أبى طالب

الدكتور رؤاس قلعه جى

موسوعة عبد الله بن مسعود

الدكتور رؤاس قلعه جى

الموسوعة الفقهية

وزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية، الكويت

